رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۷۳۴

جمادی الاخریٰ ۱۳۷۶ھ — جلد ۴۷ عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک ، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھہ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

خــــالی صفحــــه

ترجمان القرآن

لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۷	جمادی الاخریٰ ۱۳۷۶ھ مطابق مارچ ۱۹۵۷ء	عدد ۶

ابوالخیر مودودی پرنٹر و پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس سے پہلے اِن صفحات میں جن انسانی کمزوریوں کا ذکر کیا جا چکا ہے ان سے نوعیت میں مختلف، مگر نتائج کے اعتبار سے قریب قریب اتنی ہی نقصان دہ ایک اور کمزوری بھی انسانوں میں بہ کثرت پائی جاتی ہے جسے ہم "ضعفِ ارادہ" کا نام دے سکتے ہیں۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک تحریک کی دعوت سُن کر اسے صدقِ دل سے لبیک کہتا ہے۔ اور اول اول خاصا جوش بھی دکھاتا ہے، مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ اُسے نہ اُس مقصد سے کوئی حقیقی لگاؤ باقی رہتا ہے جس کی خدمت کے لیے وہ آگے بڑھا تھا، اور نہ اس جماعت کے ساتھ کوئی عملی وابستگی باقی رہتی ہے جس میں وہ دلی رغبت کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ اُس کا دماغ بدستور اُن دلائل پر مطمئن رہتا ہے جن کی بنا پر اس تحریک کو اس نے برحق مانا تھا۔ اُس کی زبان بدستور اس کے برحق ہونے کا اقرار کرتی رہتی ہے۔ اس کے دل کی شہادت بھی یہی رہتی ہے کہ یہ کام کرنے کا ہے اور ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے جذبات سرد پڑ جاتے ہیں اور قوائے عمل کی حرکت سست ہوتی چلی جاتی ہے۔ اِس میں کسی بدنیتی کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ مقصد سے انحراف بھی نہیں ہوتا۔ نظریے کی تبدیلی بھی قطعاً واقع نہیں ہوتی۔ اِسی وجہ سے آدمی جماعت کو چھوڑنے کا خیال نہیں کرتا۔ مگر بس، وہ ارادے کی کمزوری ہوتی ہے جو ابتدائی جوش ٹھنڈا ہو جانے کے بعد مختلف شکلوں میں اپنے کرشمے دکھانے شروع کر دیتی ہے۔

ضعفِ ارادہ کا ابتدائی ظہور کام چوری کی صورت میں ہوتا ہے۔ آدمی ذمہ داریاں قبول کرنے سے جی چرانے لگتا ہے۔ مقصد کی راہ میں وقت اور محنت اور مال خرچ کرنے سے گریز کرنے لگتا ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے کام کو اُس کام پر ترجیح دینے لگتا ہے جسے وہ زندگی کا نصب العین قرار دے کر آیا تھا۔ اس کے اوقات میں،

اس کی مقتدی ہیں، اس کے مال میں، اس کے نام نہاد مقصدِ حیات کا حصہ کم سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جس جماعت کو وہ برحق جماعت مان کر اس سے وابستہ ہوا تھا اس کے ساتھ بھی وہ صرف نظم اور ضابطے کا تعلق باقی رکھتا ہے۔ اس کے بھلے اور بُرے سے کوئی غرض نہیں رکھتا، نہ اس کے معاملات میں کسی قسم کی دلچسپی لیتا ہے۔

یہ حالت کچھ اس طرح بتدریج طاری ہوتی ہے جیسے جوانی پر بڑھاپا آتا ہے۔ اگر آدمی اپنی اس کیفیت پر نہ خود متنبہ ہو، نہ کوئی اسے متنبہ کرے، تو کسی وقت بھی وہ یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ جس چیز کو میں اپنا مقصدِ زندگی قرار دے کر جان ومال کی بازی لگانے کے لیے اٹھا تھا، اُس کے ساتھ اب یہ کیا معاملہ کرنے لگا ہوں۔ یوں محض غفلت اور بے خبری کے عالم میں آدمی کی دلچسپی و وابستگی بے جان ہوتی چلی جاتی ہے، حتیٰ کہ کسی روز بے خبری ہی میں اس کی طبعی موت واقع ہو جاتی ہے۔

جماعتی زندگی میں اگر پہلے آدمی کے اندر اس کیفیت کے ظہور کا نوٹس نہ لیا جائے اور اس کے نشوونما کو روکنے کی فکر نہ کی جائے تو ایک ضعیف الارادہ شخص کی چھوت دوسرے تمام اُن لوگوں کو لگنی شروع ہو جاتی ہے جن کے اندر ضعفِ ارادہ پیدا ہو رہا ہو۔ اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ مل جاتا ہے۔ اچھے خاصے سرگرم آدمی دوسروں کو کام نہ کرتے دیکھ کر خود بھی کام چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ یہ نہیں سوچتا کہ میں کسی اور کے لیے نہیں، خود اپنے مقصدِ حیات کی خدمت کے لیے آیا تھا، اگر دوسرے اپنا مقصد چھوڑ چکے ہیں تو میں اپنے مقصد سے کیوں دست بردار ہو جاؤں۔ ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جو صرف اس لیے جنت کے راستے پر چلنا چھوڑ دے کہ دوسرے ساتھیوں نے چھوڑ دیا ہے۔ گویا جنت اس کی اپنی منزلِ مقصود نہ تھی، یا وہ اس شرط کے ساتھ جنت جانا چاہتا تھا کہ دوسرے بھی وہاں جائیں، اور شاید وہ دوسروں ہی کے ساتھ وہ جہنم جانے کا ارادہ بھی کرلے اگر انہیں اُس طرف جاتے دیکھے، کیونکہ اس کا اپنا مقصد کوئی نہیں ہے، جو کچھ دوسروں کا مقصد ہے وہی اس کا بھی ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو جانے والے لوگ ہمیشہ کام نہ کرنے والوں کو مثال بناتے ہیں، کام کرنے والوں میں انہیں کوئی قابلِ تقلید مثال

نہیں ملتی۔

تاہم یہ غنیمت ہے کہ کوئی شخص اس سیدھے سادھے طریقے پر ضعفِ ارادہ کی بنا پر سست پڑ جائے اور سست ہی پڑ کر رہ جائے۔ لیکن انسانی فطرت جب ایک دفعہ کمزوری میں مبتلا ہو جاتی ہے تو دوسری کمزوریاں بھی ابھرنے لگتی ہیں، اور کم ہی لوگ اس پر قادر ہوتے ہیں کہ اپنی ایک کمزوری کی مدد پر دوسری کمزوریوں کو نہ آنے دیں۔ بالعموم آدمی کو اس میں شرم محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کمزور انسان کی حیثیت سے ظاہر کرے، یا اسے برداشت کرے جائے کہ لوگ اسے کمزور سمجھیں۔ وہ سیدھی طرح اس کا اعتراف نہیں کرتا کہ ضعفِ ارادہ نے اسے سست کر دیا ہے۔ اس کے بجائے وہ اس پر پردہ ڈالنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، جن میں سے ہر طریقہ دوسرے سے بدتر ہوتا ہے۔

مثلاً وہ کام نہ کرنے کے لیے طرح طرح کے بہانے کرتا ہے اور آئے دن کوئی نہ کوئی عذر لنگ پیش کر کے ساتھیوں کو یہ فریب دینے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے کام نہ کرنے کا اصل سبب مقصد سے لگاؤ اور دلچسپی میں کمی نہیں ہے بلکہ کچھ واقعی رکاوٹیں اس کی راہ میں حائل ہیں۔ یہ گویا سستی کی مدد پر جھوٹ کو بلانا ہے اور یہاں سے اس آدمی کا اخلاقی تنزل شروع ہوتا ہے جس نے اول اول صرف ترقی کی بلندیوں پر چڑھنا چھوڑ دیا تھا۔

یہ حیلہ جب پرانا ہو کر بے کار ثابت ہونے لگتا ہے اور آدمی کو خطرہ ہوتا ہے کہ اب اصل کمزوری کا راز فاش ہوا چاہتا ہے تو وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ در اصل اپنی کمزوری کی وجہ سے سست نہیں ہوا ہے، بلکہ جماعت کی کچھ خرابیوں نے اسے بد دل کر دیا ہے۔ گویا آپ خود تو بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر کیا کریں، ساتھیوں کے بگاڑ نے دل توڑ کے رکھ دیا۔ اس طرح یہ گرتا ہوا انسان جب ایک جگہ قدم نہیں جما سکتا تو اور زیادہ نیچے اتر جاتا ہے اور اپنی کمزوری کو چھپانے کی خواہش اسے یہ مظلمہ اپنی گردن پر لینے کے لیے آمادہ کر دیتی ہے کہ جس کام کو بنانے کے قابل وہ نہ رہا تھا اسے اب بگاڑنے کی کوشش شروع کر دے۔

ابتدائی مرحلے میں یہ بددلی کا معاملہ مجمل رہتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ حضرت کیوں بددل ہیں۔ خرابیوں کی مبہم شکایتیں دبی زبان سے ظاہر ہوتی ہیں، مگر ان کی کوئی تفصیل معلوم نہیں ہوتی۔ ساتھی اگر حکمت سے کام لیں اور اصل مرض کو سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی فکر کریں تو یہ گرتا ہوا شخص مزید گرنے سے رک بھی سکتا ہے اور اوپر اٹھایا بھی جا سکتا ہے۔ لیکن اکثر نادان دوست کچھ بے جا جوش کی وجہ سے، اور کچھ اپنے جذبۂ استعجاب کی تسکین کی خاطر کھوج کرید شروع کر دیتے ہیں اور اسے اجمال کی تفصیل بیان کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ اپنی بددلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ہر طرف نظر دوڑاتا ہے۔ مختلف افراد کی انفرادی کمزوریاں چن چن کر جمع کرتا ہے۔ جماعت کے نظام اور اس کے کام میں نقائص ڈھونڈتا ہے۔ اور ایک فہرست بنا کر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہیں وہ خرابیاں جنہیں دیکھ دیکھ کر آخر کار یہ خاکسار بددل ہو گیا ہے۔ یعنی اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسا مردِ کامل، جو سب کمزوریوں سے پاک تھا، ان کمزور ساتھیوں اور ان نقائص سے لبریز جماعت کے ساتھ بھلا کس طرح آگے چل سکتا ہے؟ اور یہ طرزِ استدلال اختیار کرتے وقت شیطان اسے یہ بات بھلا دیتا ہے کہ اگر واقعی معاملہ یہ تھا تو سست پڑنے کے بجائے یہ تو اور زیادہ سرگرم ہونے کا متقاضی تھا۔ جس کام کو آپ اپنی زندگی کا نصب العین ٹھیرا کر انجام دینے کے لیے اٹھے تھے اسے اگر دوسرے اپنی خامیوں سے بگاڑ رہے تھے تو آپ اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اسے بنانے میں لگ جاتے اور اپنی خوبیوں سے دوسروں کی ان خامیوں کا تدارک فرماتے۔ آپ کے گھر میں آگ لگی ہو اور گھر کے دوسرے افراد اسے بجھانے میں کوتاہی برتیں تو آپ بددل ہو کر بیٹھ جائیں گے، یا جلتے ہوئے گھر کو بچانے کے لیے ان کوتاہ دستوں سے بڑھ کر چابک دستی دکھائیں گے؟

اس معاملے کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے اور اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش میں خود اپنے نامۂ اعمال کا سارا حساب دوسروں کے نامۂ اعمال میں درج کر ڈالتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ ہمارے اعمال کا کوئی ریکارڈ ایسا بھی ہے جس میں کسی کی مکاری سے ایک شوشہ بھی نہیں بدل سکتا۔ وہ دوسروں کے نامۂ اعمال میں بہت سی وہ کمزوریاں گنتا ہے جن میں وہ خود

مبتلا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کے کردار میں بہت سی اُن خرابیوں کی نشان دہی کرتا ہے جن کے پیدا کرنے میں اس کا اپنا حصہ دوسروں سے کم نہیں، کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہ اُن کاموں پر سراپا شکایت بنا ہوا نظر آتا ہے جو اس کے اپنے کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کہتا ہے کہ یہ کچھ دیکھ کر اس کا دل ٹوٹ گیا ہے تو اس کے معنی صاف، یہ ہوتے ہیں کہ ان سب چیزوں سے وہ خود بری الذمہ ہے۔

کوئی انسانی جماعت کمزوریوں سے خالی نہیں ہوتی۔ نہ کوئی انسانی کام نقائص سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاشرے کی اصلاح و تعمیر کے لیے فرشتے فراہم ہوں اور سارا کام معیارِ کمال کے مطابق کریں۔ کمزوریاں ڈھونڈیے تو کہاں نہ مل جائیں گی۔ نقائص تلاش کیجیے تو کس جگہ وہ نہ پائے جائیں گے۔ انسانی کام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ ہی ہوا کرتے ہیں اور معیارِ کمال تک پہونچنے کی ساری کوششوں کے باوجود کسی ایسی حالت پر پہونچنے کی، کم از کم اس دنیا میں، امید نہیں کی جا سکتی جہاں انسان اور اس کا کام مستورح درقدوس ہو جائے۔

اس حالت میں اگر کمزوریوں اور خامیوں کی نشان دہی اس غرض کے لیے ہو کہ انہیں رفع کرنے اور معیارِ کمال کی طرف بڑھنے کے لیے مزید جد وجہد کی جائے تو اس سے زیادہ مبارک کام کوئی نہیں۔ انسانی کاموں میں جو اصلاح و ترقی بھی ممکن ہے اسی طریقے سے ممکن ہے۔ اور اس سے غفلت تباہ کن ہے۔ لیکن اگر انفرادی کمزوریاں اور اجتماعی خامیاں اس لیے تلاش کی جائیں کہ انہیں کام نہ کرنے اور بددل ہو کر بیٹھ جانے کے لیے بہانہ بنایا جائے، تو یہ خالص شیطانی وسوسہ اور نفسِ امّارہ کا کرشمہ ہے۔ یہ بہانہ بہتر سے بہتر ممکن حالات میں بھی ہر حیلہ جو انسان کو مل سکتا ہے، اس بہانے کا سدِّ باب اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک فرشتوں کی کوئی ٹولی انسانی جماعتوں کی جگہ لینے کے لیے نہ آ جائے۔ اور اس بہانے کو پیش کرنا کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتا جو خود کمزدیوں اور خامیوں سے اپنی ذاتِ اقدس کے پاک ہونے کا ثبوت مہیا نہ کر دے۔ اس طرح کی باتوں کا حاصل کبھی یہ نہیں ہوتا کہ کوئی کمزوری دور ہو، یا کوئی خامی رفع ہو جائے۔ بلکہ یہ کمزدیوں اور خامیوں کو بڑھانے کا مجرب نسخہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص یہ راہ اختیار کر کے

اپنے گرد و پیش کے دوسرے تمام ضعیف الارادہ لوگوں کے لیے ایک غلط مثال بن جاتا ہے۔ وہ ان سب کو یہ راہ دکھا دیتا ہے کہ اپنے ضعف کا اعتراف کر کے نکو بننے سے بچیں، اور خود اپنے نفس کو بھی فریب دے کر مطمئن کریں۔ اُس کی پیروی میں ہر بے عمل آدمی بد دلی کا ڈھونگ رچانے لگتا ہے اور اس بد دلی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ساتھیوں کی کمزوریاں اور جماعت کی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک فہرست تیار کرنی شروع کر دیتا ہے۔ پھر اس سے بدی کا ایک چکر چل پڑتا ہے۔ ایک طرف جماعت میں عیب چینی، خوردہ گیری اور الزام و جوابِ الزام کی ایک وبا پھوٹ پڑتی ہے جو اس کے اخلاقی مزاج کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ دوسری طرف اچھے خاصے سرگرم اور مخلص آدمی، جو کسی ضعفِ ارادہ میں مبتلا نہ تھے، کمزوریوں اور خامیوں کے اس چرچے سے متاثر ہو کر بد دلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور جب اس مرض کی روک تھام کے لیے کچھ کیا جاتا ہے تو بد دلوں کا ایک بلاک بننے لگتا ہے۔ بد دلی ایک مسلک اور ایک تحریک کی شکل اختیار کرتی ہے۔ بد دل ہونا، بد دل کرنا اور بد دلی کے حق میں دلائل فراہم کرنا بجائے خود ایک کام بن جاتا ہے، اور جو لوگ اصل مقصد کے لیے کام کرنے میں سست ہو چکے تھے وہ اس کام میں خوب چستی دکھانے لگتے ہیں۔ یوں ان کی مری ہوئی دلچسپی زندہ ہوتی ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ اس کا زندہ ہونا اس کی موت سے زیادہ افسوسناک ہوتا ہے۔

یہ ایک اور خطرہ ہے جس سے ہر اُس جماعت کو خبردار رہنا چاہیے جو اصلاح و تعمیر کی سعی کے لیے اٹھے۔ اس کے کارکنوں اور کارفرماؤں کو ضعفِ ارادہ کے نقصانات، اور اس کی بسیط اور مرکب صورتوں کے فرق اور ان میں سے ہر ایک کے اثرات و نتائج سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے اور اس کے ابتدائی آثار نمودار ہوتے ہی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

ضعفِ ارادہ بسیط یہ ہے کہ جماعت میں کوئی شخص اِس کام کو برحق اور اُس کا بیڑا اٹھانے والی جماعت کو صحیح مانتے ہوئے، عملاً سستی، اور دلچسپی میں کمی دکھانی شروع کر دے۔ اس صورت کے رونما ہوتے ہی چند تدبیریں اختیار کرنی چاہییں۔

ایک یہ کہ ایسے شخص کے حالات کی تحقیق کر کے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کی سستی کی وجہ آیا ضعفِ ارادہ

ہی ہے یا کچھ حقیقی مشکلات ہیں جو اسے سست کر رہی ہیں۔ اگر حقیقی مشکلات پائی جائیں تو جماعت کو ان سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ انہیں رفع کرنے میں ایک رفیق کی مدد بھی کی جائے اور اس کی سستی دوسروں کی نگاہ میں کوئی غلط معنی بھی نہ پہن سکے، نہ کسی کے لیے غلط نظیر بن سکے۔ اور اگر اصل سبب ضعف ارادہ ہی متحقق ہو تو بھونڈے طریقوں سے اجتناب کرتے ہوئے، حکمت کے ساتھ ایسے شخص کے معاملے کو جماعت کے سامنے اُن لوگوں کے معاملے سے ممیز ہو جانا چاہیے جو حقیقی مشکلات کی وجہ سے کام میں سرگرم نہ ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضعیف الارادہ آدمی کی حالت جس وقت بھی نوٹس میں آئے اُس کے ضعف کو تذکیر و تلقین اور نصیحت کے ذریعہ سے دور کرنے کی کوشش شروع کر دینی چاہیے۔ خصوصیت کے ساتھ جماعت کے بہتر آدمیوں کو اُس کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ اس کے مرتے ہوئے جذبے کو اکسائیں اور عملاً اسے اپنے ساتھ لگا کر حرکت میں لانے کی سعی کریں۔

تیسرے یہ کہ ایسے شخص کو ٹوکتے رہنا چاہیے تاکہ جماعت میں اس طرح کی سستی اور بے عملی ایک معمولی چیز نہ بن جائے اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کا سہارا لے کر بیٹھتے نہ چلے جائیں۔ اگر جماعت کے اندر وقتاً فوقتاً اس امر کا محاسبہ ہوتا رہے کہ کون وقت اور محنت اور مال کا کتنا ایثار کر سکتا ہے اور کتنا کر رہا ہے، اور کس کی کارگزاری اس کی واقعی استعداد سے کیا نسبت رکھتی ہے، تو یہ ہر اس شخص کے لیے کسی نہ کسی حد تک خجالت کا موجب ہوگا جو محاسبہ کی میزان میں ہلکا اُترتا ہو اور یہ خجالت لوگوں کو سست پڑنے سے روکتی رہے گی۔ لیکن یہ محاسبہ اس انداز سے نہ ہونا چاہیے کہ بسیط ضعفِ ارادہ کا مریض مرکب ضعفِ ارادہ میں مبتلا ہو جائے۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک شخص میں جو کمزوری پیدا ہو رہی ہے اسے اگر رفع نہ کیا جا سکے تو کم از کم بڑھنے نہ دیا جائے۔ نادانی کے ساتھ ضرورت سے زیادہ جوش دکھانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک برائی میں پڑا ہوا آدمی اس سے شدید تر برائی کی طرف زبردستی دھکیل دیا جاتا ہے۔

ضعفِ ارادہ مرکب یہ ہے کہ آدمی اپنی کمزوری پر جھوٹ اور مکر کے پردے ڈالنے کی کوشش کرے اور بڑھتے بڑھتے یہ ثابت کرنے پر اُتر آئے کہ خرابی اُس میں نہیں بلکہ جماعت میں ہے۔ یہ محض ایک کمزوری

(باقی بر صفحہ ۵۷)

تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل

جماعتِ اسلامی پاکستان کے اجتماعِ ارکان کا فیصلہ

فروری ۱۹۵۷ء کے تیسرے ہفتہ میں جماعتِ اسلامی پاکستان کے ارکان کا ایک اہم اجتماع بہاولپور ڈویژن کے ایک غیر معروف قریہ ماچھی گوٹھ نامی میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجتماع میں جماعت کے پچھلے کام اور آئندہ کام کے بارے میں جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ ایک قرارداد پر مشتمل ہے۔ اور اس پر بحث کے سلسلے میں جو تقریریں کی گئی ہیں انہیں تحریکِ اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بڑی تعلیمی اہمیت حاصل ہے۔ اسی لیے ان صفحات میں اجتماع کی روداد کا یہ حصہ درج کیا جا رہا ہے۔

قرارداد

جماعتِ اسلامی پاکستان اس امر پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لاتی ہے کہ اب سے پندرہ سال قبل جس نصب العین کو سامنے رکھ کر، اور جن اصولوں کی پابندی کا عہد کر کے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا، آج تک وہ اسی منزلِ مقصود کی طرف انہی اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ اس طویل اور کٹھن سفر کے دوران میں اگر اس سے اقامتِ دین کے مقصد کی کوئی خدمت بن آئی ہے تو وہ سراسر اللہ کا فضل ہے جس پر وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہے۔ اور اگر کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں سرزد ہوئی ہیں تو وہ اس کے اپنے ہی قصور کا نتیجہ ہیں جن پر وہ اپنے مالک سے عفو و درگزر اور مزید ہدایت و توفیق کی دعا کرتی ہے۔

جماعتِ اسلامی اس بات پر مطمئن ہے کہ تحریکِ اسلامی کا جو لائحہ عمل نومبر ۱۹۵۱ء میں ارکان کے اجتماعِ عام منعقدہ کراچی میں امیرِ جماعت نے مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے پیش کیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے

ساتھ مقصد تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اور وہی آئندہ بھی اس تحریک کا لائحہ عمل رہنا چاہیے۔

اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزا (یعنی تطہیر افکار و تعمیر افکار، صالح افراد کی تلاش و تنظیم و تربیت اور اجتماعی اصلاح کی سعی) تو جماعت اسلامی کی تشکیل کے پہلے ہی دن سے اس کے لائحہ عمل کے اجزاء لازم رہے ہیں، البتہ ان کو عمل میں لانے کی صورتیں حالات وضروریات کے لحاظ سے اور جماعت کے وسائل و ذرائع کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جماعت اب یہ طے کرتی ہے کہ آئندہ کوئی دوسرا اجماعی فیصلہ ہونے تک ان تینوں اجزاء کو اس پروگرام کے مطابق عملی جامہ پہنایا جائے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کیا جارہا ہے۔ نیز جماعت کا یہ اجتماع عام مجلس شوریٰ، اور تمام حلقوں، اضلاع اور مقامات کی جماعتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اس پروگرام پر اس حد تک زور دیں کہ لائحہ عمل کے چوتھے جزء کے ساتھ جماعت کے کام کا ٹھیک توازن قائم ہوجائے اور قائم رہے۔

اس لائحہ عمل کا چوتھا جزء، جو نظام حکومت کی اصلاح سے متعلق ہے، درحقیقت وہ بھی ابتدا ہی سے جماعتِ اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا۔ جماعت نے ہمیشہ اس سوال کو زندگی کے عملی مسائل میں سب سے اہم اور فیصلہ کن سوال سمجھا ہے کہ معاملاتِ زندگی کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہے یا فاسقین کے ہاتھ میں، اور حیاتِ دنیا میں امامت و رہنمائی کا مقام خدا کے مطیع فرمان بندوں کو حاصل ہے یا اس کی اطاعت سے آزاد رہنے والوں کو۔ جماعت کا نقطۂ نظر ابتدا سے یہ ہے کہ اقامتِ دین کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک اقتدار کی کنجیوں پر دین کا تسلط قائم نہ ہوجائے۔ اور جماعت ابتدا ہی سے یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھتی ہے کہ دین کا یہ تسلط یک لخت کبھی قائم نہیں ہوسکتا، بلکہ یہ ایک تدریجی عمل ہے جو غیر دینی نظام کے مقابلے میں دینی نظام چاہنے والوں کی باہم کشمکش اور درجہ بدرجہ پیش قدمی سے ہی مکمل ہوا کرتا ہے۔ جماعت اسلامی نے اس مقصد کے لیے تقسیم ہند سے پہلے اگر عملاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا تو اس کی وجہ موانع کا فقدان اور ذرائع کی کمی بھی تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ اس وقت کے نظام میں اس مقصد کے لیے کام کرنے میں بعض شرعی موانع تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جب اللہ تعالیٰ

نے موانع اور ذرائع دونوں فراہم کر دیے اور شرعی موانع کو دور کرنے کے امکانات بھی پیدا کر دیے تو جماعت نے اپنے لائحہ عمل میں اس چوتھے جزء کو بھی، جو اس کے نصب العین کا ایک لازمی تقاضا تھا شامل کر لیا۔ اس میدان میں دس سال کی جد وجہد کے بعد اب غیر دینی نظام کی حامی طاقتوں کے مقابلے میں دینی نظام کے حامیوں کی پیش قدمی ایک اہم مرحلے تک پہنچ چکی ہے۔ ملک کے دستور میں دینی نظام کے بنیادی اصول منوائے جا چکے ہیں۔ اور ان منوائے ہوئے اصولوں کو ملک کے نظام میں عملاً نافذ کرانے کا انحصار اب قیادت کی تبدیلی پر ہے۔ اس موقع پر ایک صالح قیادت بروئے کار لانے کے لیے صحیح طریق کار یہ ہی کہ اس لائحہ عمل کے چاروں اجزاء باہم توازن کے ساتھ اس طرح کام کرتے ہوئے آگے بڑھا جائے، کہ ہر جزء کا کام دوسرے جزء کے لیے موجب تقویت ہو، اور جتنا کام پہلے تین اجزا میں ہوتا جائے، اسی نسبت سے ملک کے سیاسی نظام میں دینی نظام کے حامیوں کا نفوذ و اثر عملاً بڑھتا چلا جائے۔ مگر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ توازن قائم نہ رہنے کو کسی وقت بھی اس لائحہ عمل کے کسی جزء کو ساقط یا معطل یا مؤخر کر دینے کے لیے دلیل نہ بنایا جا سکے گا۔

علاوہ بریں چونکہ جماعت اسلامی اپنے دستور کی رو سے اپنے پیش نظر اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں پر کام کرنے کی پابند ہے، اور پاکستان میں اس اصلاح و انقلاب کے عملاً رونما ہونے کا ایک ہی آئینی راستہ ہے، اور وہ ہے انتخابات کا راستہ، اس لیے جماعت اسلامی ملک کے انتخابات سے بے تعلق تو بہرحال نہیں رہ سکتی، خواہ وہ ان میں بلاواسطہ حصہ لے یا بالواسطہ یا دونوں طرح۔ رہا یہ امر کہ انتخابات میں کس وقت ان تینوں طریقوں میں سے کس طریقے سے حصہ لیا جائے، اس کو جماعت اپنی مجلس شوریٰ پر چھوڑتی ہے تاکہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر حالات کا جائزہ لے کر اس کا فیصلہ کرے۔

(وہ پروگرام جس کا ذکر اس قرارداد کے پیراگراف نمبر ۳ میں کیا گیا ہے حسب ذیل ہے:)

ا۔ جماعت کی اندرونی اصلاح کا پروگرام

ا۔ تمام مقامی جماعتیں اس امر کا خاص اہتمام کریں کہ اگر ان کے ارکان اور رفقائے جماعت کے

درمیان کوئی نزاع پیدا ہو جائے تو اسے ہرگز پرورش پانے نہ دیا جائے بلکہ علم میں آتے ہی فوراً اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ جس حلقہ کی کسی ماتحت جماعت میں کوئی خرابی رونما ہو اس کے نظم کو جلدی سے جلدی خود اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ اور اگر اس کو کسی بیرونی مدد کی ضرورت ہو تو ضلع اور حلقے کے نظم سے مدد طلب کرنی چاہیے۔

۳۔ ہر حلقہ کی جماعت اپنے حلقے کے عمدہ کارکنوں کی ایک ٹیم مقرر کرے جس سے بوقت ضرورت اصلاح حال اور کمزور علاقوں میں کام کو آگے بڑھانے کے لیے کام لیا جائے۔

۴۔ جہاں کسی حلقے کے نظم کی حالت خود قابلِ اصلاح ہو وہاں مرکز کی ہدایات کے ماتحت اصلاحِ حال کے لیے باہر سے کارکن بھیجے جائیں جو حالات کا مطالعہ کر کے خرابی کے اسباب متعین، اور اصلاح کی تدابیر تجویز کریں اور ان کو عملی جامہ پہنانے کی صورتیں اختیار کریں۔ اس غرض کے لیے ایک مرکزی ٹیم بھی مقرر کی جائے جس کے ارکان جہاں بھی اس طرح کی کوئی ضرورت پیش آئے بروقت بھیج دیے جائیں، اور انہیں اصلاح حال کے لیے تمام مناسب اقدام کرنے کا پورا اختیار رہو۔

۵۔ جماعت کے اندر خرابیوں کے در آنے کی ایک بڑی وجہ محاسبہ کی کمی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقامی ضلعی، اور حلقوں کے ہفتہ وار، سہ ماہی اور ششماہی اجتماعات پابندی کے ساتھ منعقد کیے جائیں اور ان میں ارکان کی اخلاقی و دینی حالت، ان کے معاملات، اور جماعت کے نظم میں ان کے طرز عمل کا اچھی طرح محاسبہ کیا جاتا رہے۔ اور اگر کوئی کارکن اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود درست نہ ہو تو جماعت سے اس کے اخراج کی کارروائی میں بے جا تساہل سے کام نہ لیا جائے۔

۶۔ کارکنوں کی تربیت کے لیے تربیت گاہیں خاص اہتمام کے ساتھ برابر قائم کی جاتی رہیں اور تربیت گاہوں کے اختتام کے بعد بھی اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ کارکنانِ جماعت قرآن و حدیث اور دینی لٹریچر کا برابر مطالعہ کرتے رہیں، تربیت کے طریقے میں اب تک کے تجربات کو ملحوظ

رکھ کر جن اصلاحات کی ضرورت محسوس کی جائے وہ مختلف حلقوں کی مجالسِ شوریٰ کی طرف سے ۱۵ اپریل ۵۷ تک مرکز میں بھیج دی جائیں تاکہ مرکزی مجلس شوریٰ ان پر غور کر کے تربیت کا ایک بہتر نظام تجویز کر سکے۔

۷۔ مشرقی پاکستان کے کارکنوں کی تربیت کی طرف خاص توجہ کی جائے اور اس حد تک انہیں تیار کر دیا جائے کہ وہ اپنے حلقے میں تربیت کا کام خود سنبھال سکیں۔

۲۔ علمی و فکری میدان میں کام کا پروگرام

۱۔ جماعت کا تمام ضروری لٹریچر ۱۹۵۸ء کے اختتام تک انگریزی میں منتقل کر دیا جائے۔

۲۔ علمی تحقیقات کی تربیت کا ایک ادارہ قائم کیا جائے، اور جب تک ایسا ادارہ قائم نہ ہو سکے، اس وقت تک جماعت کے ان کارکنوں سے جو اچھی علمی صلاحیتیں رکھتے ہوں، مختلف شعبوں میں کام لینے کی کوشش کی جائے اور ایسے کارکنوں پر جماعت کی دوسری سرگرمیوں کا بار نہ ڈالا جائے۔

۳۔ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو اسلام سے متعلق ضروری کتابیں اردو میں منتقل کرے۔

۴۔ خواتین کے لیے ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو تعلیم و تربیت کا کام بھی کرے اور اسی کا ایک شعبہ خواتین کے لیے لٹریچر بھی تیار کرے۔

۵۔ مسئلہ قومیت، پردہ، تنقیحات، دعوتِ دین اور اس کا طریق کار، سود حصہ اول و دوم، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی اور تفہیم القرآن جلد اول و دوم کو ۱۹۵۸ء کے آخر تک لازماً بنگلہ میں منتقل کر کے شائع کر دیا جائے (ان میں سے بعض کتابیں زیر تکمیل ہیں اور تفہیم القرآن کا ترجمہ بالاقساط ہفتہ وار توحید کھلنا میں شائع ہو رہا ہے)۔

۶۔ ترجمان القرآن کا بنگلہ ایڈیشن ڈھاکہ سے شائع کیا جائے۔ (سردست "جہان نو" کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار ڈھاکہ سے جاری کر دیا گیا ہے)۔

۷۔ ایک ایسا دارالعلوم قائم کیا جائے جس میں ضروری ترمیم اور علوم جدیدہ کے ضروری اضافے

کے ساتھ درس نظامی کی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا انتظام ہو۔ (اس دار العلوم کا افتتاح ۱۶ شوال ۱۳۷۵ مطابق ۲۷ مئی ۱۹۵۶ء کوڈیپر ضلع حیدر آباد میں کر دیا گیا ہے)۔

۸۔ جہاں جہاں حالات سازگار ہوں ایسے پرائمری اسکول قائم کیے جائیں جن میں محکمۂ تعلیم کے مقرر کردہ نصاب کے ساتھ دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کا عمدہ انتظام ہو۔

(اس طرح کے مدارس لاہور، لائل پور اور کوئٹہ میں اس وقت چل رہے ہیں)

۹۔ تعلیم بالغان کے لیے جگہ جگہ مراکز قائم کیے جائیں۔ تعلیم یافتہ ارکان اور متفقین سے اس کام کے لیے وقت لیا جائے اور ۱۹۵۸ء کے اختتام تک کم از کم ۲۵ ہزار ناخواندہ آدمیوں کو خواندہ بنا یا جائے۔ خواندگی کا کم سے کم معیار یہ ہونا چاہیے کہ آدمی اردو لکھ پڑھ سکے، قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے قابل ہو جائے اور قرآن مجید کی کم از کم ان سورتوں کا ترجمہ سیکھ لے جو بالعموم نمازوں میں پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ یہ کوشش بھی کی جائے کہ ان بالغ طالب علموں کی دینی و اخلاقی حالت عملاً درست ہو اور ان میں اپنے گردوپیش کے معاشرے کی اصلاح کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

(تعلیم بالغان کے سلسلے میں رہنمائی اور مفصل طریق کار تجویز کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس کی رپورٹ تمام جماعتوں کو آغاز کار کے لیے بھیجی جا چکی ہے۔ کئی مقامات پر تعلیم بالغان کے مراکز قائم بھی ہو چکے ہیں)۔

۱۰۔ ۱۹۵۸ء کے آخر تک مغربی پاکستان میں دار المطالعوں کی تعداد پانچ سو تک بڑھا دی جائے۔

۳۔ توسیع جماعت کا پروگرام

۱۹۵۸ء کے آخر تک مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی کے متفقین کی تعداد چالیس ہزار تک اور مشرقی پاکستان میں دس ہزار تک پہونچا دی جائے۔

۴۔ عوامی اصلاح و تربیت کا پروگرام

تمام جماعتوں، حلقہ ہائے متفقین اور دوسرے کارکنانِ جماعت کا فرض ہے کہ وہ اپنے حالات اور

وسائل کے مطابق حسب ذیل قسم کے کاموں کو اپنے ہاں زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کریں۔

۱۔ جماعت کی بنیادی دعوت کو وسیع پیمانے پر پھیلانا۔

(اس سلسلے میں تمام کارکنوں کو یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جماعت اسلامی کا اصل کام جس پر تمام دوسری سرگرمیوں کی بنا قائم ہوتی ہے، عوام الناس کو اطاعتِ خدا و رسول کی طرف بلانا، آخرت کی بازپرس کا احساس دلانا، خیر و صلاح اور تقویٰ کی تلقین کرنا، اور اسلام کی حقیقت سمجھانا ہے۔ یہ کام لٹریچر، تقریر، تعلیم، زبانی گفتگو اور تمام دوسرے ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر ہونا چاہیے۔)

۲۔ مساجد کی اصلاح حال۔

(اس میں مسجدوں کی تعمیر، ان کی مرمت، ان کے لیے فرش، پانی اور دوسری ضروریات اور آسائشوں کی فراہمی نیز اذان، نماز باجماعت، امام، درس و تدریس اور خطباتِ جمعہ وغیرہ جملہ امور کا اطمینان بخش انتظام شامل ہے۔ اگر لوگ مسجد کی اہمیت اور اس کے مقام کو سمجھنے لگیں تو بستی اور محلہ میں مسجد سے زیادہ دل کش جگہ اور کوئی نہ ہو)۔

۳۔ عوام میں علم دین پھیلانا۔

(ظاہر ہے کہ دین کے علم کے بغیر آدمی دین کی راہ پر نہیں چل سکتا۔ اگر اتفاق سے چل رہا ہے تو اس کے ہر آن بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر لوگ نہ دین کو جانیں اور نہ اس پر چلیں تو اسلامی نظام کا خواب کبھی حقیقت کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس لیے دین خود بھی سیکھیے اور دوسروں کو بھی سکھانے کا انتظام کیجیے۔ دوسروں تک اسے پہونچانے کے لیے گفتگوؤں، مذاکرات، تقاریر، خطبات، درس، اجتماعی مطالعہ، تعلیم بالغان، دارالمطالعوں اور اسلامی لٹریچر کی عام اشاعت اور تقسیم کو ذریعہ بنائیے۔ یاد رکھیے کہ دین کا علم پھیلانا ان کاموں میں سے ہے جو صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتے ہیں)

۴۔ غنڈہ گردی کے مقابلے میں لوگوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرنا، عام طور پر لوگوں کو ظلم و ستم سے بچانا، شہریوں کے اندر اخلاقی فرائض اور ذمہ داریوں کے احساس کو بیدار کر کے ان کی ادائیگی پر ان کو آمادہ کرنا اور شہروں اور دیہات کی اخلاقی حالت کو درست کرنا۔

(صدیوں کے انحطاط کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں اب بدی اور برائی منظم، بے باک، جری اور ایک دوسرے کی پشت پناہ بن چکی ہے۔ اور نیکی اور شرافت اب انتشار، پست ہمتی، بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس صورت حال کو پھر سے بدلنا ہے اور نیکی اور شرافت کو منظم، بے باک اور نڈر بنا کر اسے معاشرے کے ہر گوشے میں حکمراں طاقت کی حیثیت دینا ہے)

۵۔ سرکاری محکموں اور اداروں سے عام لوگوں کی شکایات رفع کرانے میں ان کی امداد کرنا اور داد رسی حاصل کرنے میں ان کی رہنمائی کرنا۔

۶۔ بستی کے یتیموں، بیواؤں، معذوروں اور غریب طالب علموں کی فہرستیں تیار کرنا، اور جن جن طریقوں سے ممکن ہو ان کی مدد کرنا۔ اس غرض کے لیے زکوٰۃ، عُشر اور صدقات کی رقوم کی تنظیم اور بیت المال کے ذریعے ان کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام کرنا چاہیے۔

۷۔ دیہات اور محلوں میں تعلیم بالغان کے مراکز اور دارالمطالعوں کا قیام اور عام لوگوں میں ان سے استفادہ کا شوق پیدا کرنا۔

۸۔ فواحش کی روک تھام اور ان کے خلاف عوامی ضمیر اور احساس شرافت کو بیدار کرنا۔

(فواحش کے سلسلے میں کسی ایک ہی گوشے پر نظر محدود نہیں کر دینی چاہیے بلکہ اس کے تمام سرچشموں پر نگاہ رکھنی چاہیے۔ مثلاً ۱۔ قحبہ خانے، ۲۔ شراب خانے، ۳۔ سینما کی پبلسٹی، ۴۔ دکانوں پر عریاں تصاویر کے سائن بورڈ، ۵۔ ٹورنگ سینما اور تھیٹریکل کمپنیاں، ۶۔ مخلوط تعلیم، ۷۔ اخبارات میں فحش اشتہارات اور فلمی مضامین، ۸۔ ریڈیو پر فحش گانوں کے پروگرام، ۹۔ دکانوں اور مکانوں پر فحش گانوں کا ریکارڈنگ، ۱۰۔ قمار بازی کے اڈے، ۱۱۔ رقص کی مجالس، ۱۲۔ فحش لٹریچر اور عریاں تصاویر اور جنسی رسائل، ۱۳۔ آرٹ اور کلچر کے نام سے بے حیائی پھیلانے والی سرگرمیاں، ۱۴۔ بینا بازار، ۱۵۔ عورتوں میں روز افزوں بے پردگی کی وبا)۔

۹۔ رشوت و خیانت اور سفارش کی لعنت کے خلاف رائے عام کو منظم کرنا اور سرکاری حکام اور ماتحت کارکنوں میں خدا ترسی، فرض شناسی اور آخرت کی جواب دہی کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کرنا۔

(اس غرض کے لیے ان حلقوں میں "اسلامی ریاست میں کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف" کی عام اشاعت کی جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ عدالتوں، تھانوں اور دوسرے سرکاری دفاتر میں قرآن مجید اور حدیث شریف اور اسلامی لٹریچر میں سے مناسب حال آیات، احادیث اور عبارتیں کتبوں کی شکل میں آویزاں کی جائیں)۔

۱۰۔ مذہبی جھگڑوں اور تفرقہ انگیزی کا انسداد۔

(اس کے لیے مختلف جماعتوں کے مذہبی پیشواؤں سے ملاقاتیں کرکے ان کو اس کے برے نتائج سے باخبر کیا جائے کہ یہ چیز کس طرح اس ملک سے اسلام کی جڑیں اکھاڑ دینے والی ہے اور اسے کس طرح ملک کے ذہین طبقہ کے اندر علما اور مذہب کے خلاف نفرت پھیلانے کے لیے مخالف اسلام عناصر کی طرف سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ نیز عام پبلک کو بھی مناسب مواقع پر اس کے نتائج سے باخبر کیا جائے اور ان سے اپیل کی جائے کہ وہ اس قسم کے فتنوں کی سرپرستی سے بالکل کنارہ کش رہیں)۔

۱۱۔ بستی کے تمام لوگوں کے تعاون سے صفائی اور حفظانِ صحت کی کوشش کرنا۔

(اگر لوگ صحت و صفائی کے سلسلے میں معمولی احتیاط بھی برتنا شروع کر دیں تو وہ بہت سی وباؤں اور بیماریوں سے اپنے آپ کو اور دوسرے شہریوں کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ بہت سی احتیاطیں اور تدابیر ایسی ہیں جن پر یا تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا یا بہت معمولی خرچ ہوتا ہے۔ جماعت کے کارکنوں کو چاہیے کہ اس سلسلے میں بھی عوام کی اصلاح و تربیت کریں۔ اس بارے میں ضروری رہنمائی کے لیے وہ ناظم شعبۂ خدمت خلق جماعت اسلامی پاکستان معرفت جماعت اسلامی کراچی اور اپنے ضلع کے ہیلتھ افسر کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔)

اس پروگرام کے مطابق کام کرتے ہوئے جماعت کے کارکنوں کو یہ بات نگاہ میں رکھنی چاہیے کہ

ہمیں ہر گوشۂ زندگی میں اسلام کے مطابق پورے معاشرے کی اصلاح کرنی ہے اور اسی پروگرام کو بتدریج ہمہ گیر اصلاح کا پروگرام بنا دینا ہے۔ کارکنوں کو اس امر کی کوشش بھی کرنی چاہیے کہ وہ اصلاح معاشرہ کے اس کام میں اپنے اپنے علاقوں کے تمام اسلام پسند اور اصلاح پسند عناصر کا تعاون حاصل کریں اور جو کوئی جس حد تک بھی ساتھ دے سکتا ہو اسے اس عام بھلائی کی خدمت میں شریک کریں۔

لائحہ عمل کی توضیح و تشریح

ابوالاعلیٰ مودودی

مندرجہ بالا قرارداد کو پیش کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی نے حسب ذیل تقریر کی:

محترم رفقاء!

جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ ہم ایک قرارداد کی صورت میں اُن خطوط کی وضاحت کر رہے ہیں جن پر ہمیں اپنی تحریک کو آگے چلانا ہے۔ اس سے پہلے پندرہ سال تک معمول یہ رہا ہے کہ اجتماعات کے موقع پر اس تحریک کے مقصد لائحہ عمل اور طریق کار کی وضاحت امیر جماعت اپنی تقریروں میں کرتا تھا اور وہی تقریریں جماعت کے لٹریچر میں شامل ہو کر تحریک کے لیے رہنمائی کا کام کرتی تھیں۔ اب اس پرانے معمول سے ہٹ کر ایک قرارداد کی صورت میں یہ چیز پیش کرنے اور متبادل تجویزوں اور ترمیموں کا موقع دینے کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی ہے کہ جماعت پوری بصیرت کے ساتھ اپنی پالیسی اور آئندہ طریق کار کا فیصلہ کرے۔ اور جتنے ممکن راستے اُس کے سامنے رکھے جائیں، ان کو اچھی طرح جانچنے اور پرکھنے کے بعد پورے اطمینان کے ساتھ ایک راستہ اختیار کرے۔

اسی ضرورت کی بنا پر میں اس قرارداد کی توضیح و تشریح میں غیر معمولی طور پر ایک مفصل تقریر کر رہا ہوں۔ یہ تفصیل نہ صرف اس لیے ضروری ہے کہ ارکان جماعت قرارداد کے ہر پہلو کو خوب سمجھ کر علیٰ وجہ البصیرت اس کے بارے میں فیصلہ کر سکیں، بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس وقت ارکان میں تین چوتھائی سے زیادہ

تعداد ایسے رفقاء کی ہے جو بیچ کے مراحل میں ہمارے ہم سفر ہوئے ہیں اور اس تحریک کا تدریجی ارتقاء پوری طرح ان کے سامنے نہیں ہے۔ انہیں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اب تک ہم کن مراحل سے گزرتے ہوئے آرہے ہیں، ہر مرحلے میں کن حالات سے دوچار ہوتے رہے ہیں، ان حالات میں ہم نے کیا قدم اٹھائے ہیں اور کیوں اٹھائے ہیں، اور اب ہم جس مقام پر کھڑے ہیں یہاں سے آگے بڑھنے کے لیے ہم کو کس طرح اپنا راستہ نکالنا ہے اور کن امور کو ملحوظ رکھ کر کام کرنا ہے۔

قرارداد کا تجزیہ اس غرض کے لیے زیر بحث قرارداد کا مدعا واضح کرنے کی خاطر یہ مناسب ہوگا کہ پہلے میں اس کا تجزیہ کر کے بتادوں کہ یہ کن نکات پر مشتمل ہے، پھر ہر نکتے کی تشریح کرتے ہوئے اس کی صحت بھی ثابت کروں اور یہ بھی دکھاؤں کہ دوسرے نکات کے ساتھ اس کا ربط کیا ہے۔

یہ قرارداد دراصل دس نکات پر مشتمل ہے:

اول یہ کہ جس نصب العین کے لیے یہ جماعت قائم ہوئی تھی، اور جن اصولوں کی پابندی کا اس نے عہد کیا تھا، آج تک وہ اسی نصب العین کی طرف، انہی اصولوں کی پابندی میں بڑھتی چلی آرہی ہے۔

دوم یہ کہ نومبر ۱۹۵۱ء میں اجتماع کراچی کے موقع پر اس تحریک کا جو لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصدِ تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اور وہی آئندہ بھی اس کا لائحہ عمل رہنا چاہیے۔

سوم یہ کہ اس لائحہ عمل کے پہلے تین اجزاء کوئی نئی چیز نہیں ہیں بلکہ اس تحریک کے یوم آغاز ہی سے وہ اس کے لائحہ عمل کے اجزاء لازم رہے ہیں۔

چہارم یہ کہ ان تینوں اجزاء کے لیے اس وقت وہ پروگرام موزوں اور کافی ہے جو اس قرارداد کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے۔

پنجم یہ کہ اس لائحہ عمل کا چوتھا جزء بھی ابتداء ہی سے جماعت اسلامی کے بنیادی مقاصد میں شامل تھا، اس کے نصب العین کا لازمی تقاضا تھا، اور اس کے لیے تقسیم ہند سے پہلے کوئی عملی اقدام نہ کرنا محض موانع اور ذرائع کے فقدان اور شرعی موانع کے سبب سے تھا۔

ششم یہ کہ قیام پاکستان کے بعد مواقع اور ذرائع بھی بہم پہونچ گئے، اور شرعی موانع کو دور کرنے کے امکانات بھی پیدا ہوگئے، اس لیے جماعت نے بالکل صحیح وقت پر اپنے عملی پروگرام میں اس جُز کو شامل کرلیا۔

ہفتم یہ کہ دس سال کی جدوجہد سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں وہ اس لائحہ عمل میں کسی ردّ و بدل کے متقاضی نہیں ہیں بلکہ صرف یہ تقاضا کرتے ہیں کہ اس کے چاروں اجزاء پر صحیح توازن کے ساتھ یکساں کام کیا جائے۔

ہشتم یہ کہ اس لائحہ عمل پر کام کرنے میں توازن تو یقیناً مطلوب ہے مگر عدم توازن کو کسی وقت بھی اس کے کسی جزء کے ساقط یا معطل یا مؤخر کرنے کے لیے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔

نہم یہ کہ ہم انتخابات سے بے تعلق بہرحال نہیں رہ سکتے، خواہ ان میں بالواسطہ حصہ لیں یا بلاواسطہ یا دونوں طرح۔

دہم یہ کہ اس معاملے کو مجلس شوریٰ پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ ہر انتخاب کے موقع پر یہ فیصلہ کرے کہ ہم ان تینوں طریقوں میں سے کس طریقے پر انتخابات میں حصہ لیں۔

اب میں سلسلہ وار اِن نکات میں سے ایک ایک پر کلام کروں گا۔

نکتۂ اول یہ قرارداد سب سے پہلے جماعت کے گزشتہ پندرہ سال کے کام کے متعلق اس اطمینان کا اظہار کرتی ہے کہ وہ اُن تمام امکانی لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود، جو بہرحال انسانی کام میں رہ ہی جاتی ہیں، ٹھیک اُسی نصب العین کی راہ پر تھا جو اول روز سے جماعت کے پیشِ نظر رہا ہے اور انہی اصولوں کے مطابق تھا جن کی پابندی کا یہ جماعت ہمیشہ اقرار و اعلان کرتی رہی ہے۔

قرارداد کا آغاز اس مضمون سے کیوں کیا گیا ہے؟ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ اس کی پہلی وجہ تو وہی ہے جس کا قرارداد کے الفاظ میں اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم آگے چلنے سے پہلے اِس فضلِ خاص پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں کہ اُس عام اور ہمہ گیر اخلاقی انحطاط اور ذہنی انتشار کے ماحول میں، جس کے اندر ہمیں کام کرنا پڑا ہے، اور اُن پے در پے آزمائشوں کے باوجود جن سے ہم کو اِس پندرہ سال کی مدت میں گزرنا پڑا ہے، ہم اپنے

نصب العین کی راہ پر ثابت قدم رہے ہیں اور ہم نے اپنے عمل سے اپنے آپ کو ایک با اصول جماعت ثابت کیا ہے۔ یہ بات ہم فخر کے طور پر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کہہ رہے ہیں، اس بنا پر کہہ رہے ہیں کہ شکرِ نعمت ہم پر واجب ہے، اور اس غرض کے لیے کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو مزید ہدایت اور توفیق سے نوازے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک محرک و متحرک جماعت کو جس طرح ہمیشہ یہ دیکھتے رہنے کی ضرورت ہے کہ اس کے کام اور نظام میں خامیاں کیا ہیں جن کی اسے اصلاح کرنی ہے، اسی طرح اُسے اِس اطمینان کی ضرورت بھی ہے کہ وہ واقعی اپنے مقصد ہی کی طرف بڑھ رہی ہے اور اپنے اصولوں پر قائم ہے۔ اس معاملے میں اگر کوئی شک اس کے دل میں پڑ جائے اور دس پندرہ برس ایک راہ پر چلنے کے بعد وہ ٹھیر کر یہ سوچنے لگے کہ کہیں ہم غلط راہ پر تو نہیں پڑ گئے ہیں، تو یہ ایک سخت حوصلہ شکن اور پریشان کن صورت حال ہوگی جو اس کی قوتِ عمل کو سرد، اور اپنے اجتماعی فہم اور کردار پر سے اس کے اعتماد کو متزلزل کر دے گی۔ اس کے بعد وہ آگے بھی اطمینان کے ساتھ کوئی قدم نہ اٹھا سکے گی، کیونکہ پھر تو اسے اپنے اوپر یہ بھروسہ رہے گا ہی نہیں کہ وہ اپنے نصب العین کا اور اس کی طرف بڑھنے کی صحیح سمت کا کوئی شعور رکھتی بھی ہے یا نہیں، اور اس میں اپنے اصولوں پر جمنے کی طاقت بھی ہے یا نہیں۔

آپ میرا مدعا سمجھنے میں غلطی نہ کریں۔ میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہم غلط بھی جا رہے ہوں تو ضرور اپنے آپ کو صحیح سمجھتے رہیں تاکہ ہمارا حوصلہ برقرار رہے۔ اس کے برعکس میرا مدعا یہ ہے کہ ہمیں پوری بصیرت کے ساتھ اپنے نصب العین اور اس کی طرف پیش قدمی کی راہ کو سمجھ کر دیکھنا چاہیے کہ ہم ٹھیک اسی کی طرف جا رہے ہیں یا نہیں، اور ان تمام اصولوں کو، جن کا آج تک ہم اقرار و اعلان کرتے رہے ہیں، سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ ہم نے من حیث الجماعت ان کی ٹھیک ٹھیک پابندی کی ہے یا نہیں۔ اور اگر بے لاگ احتساب سے ہم کو یقین ہو جائے کہ ان اعتبارات سے ہم غلط رَو اور غلط کار نہیں ہیں تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس پر مطمئن ہو کر آگے بڑھنا چاہیے اور کسی شک کو اپنے دل میں راہ نہ دینی چاہیے۔ غلطی کو غلطی مان لینا تو ضرور ایک خوبی ہے، مگر صحیح کو خواہ مخواہ غلط مان لینا، یا ہر ٹوکنے والے کی ٹوک پر شک میں پڑ جانا کوئی خوبی نہیں ہے۔

اِس حماقت میں ہم اسی وقت مبتلا ہو سکتے ہیں جب کہ یا تو ہم اتنے بلیدالذہن ہوں کہ اپنے مقصد اور اپنے کام کو سمجھنا اور جانچنا ہمارے لیے مشکل ہو جائے، یا پھر ہم اس اخلاقی کمزوری کے شکار ہو چکے ہوں کہ جب بھی کوئی ہمیں ٹوکے ہم ضرور انکسار کی نمائش کرتے ہوئے اعترافِ قصور کرنا شروع کر دیں، خواہ ٹوکنے والا اپنے ہی قصورِ فہم کی وجہ سے صحیح کو غلط کہہ رہا ہو۔

جماعتِ اسلامی کا نصب العین کیا تھا؟ آیئے اب ہم دیکھیں کہ ہمارا وہ نصب العین تھا کیا جس کے لیے ہم کام کرنے اٹھے تھے۔ اب سے پندرہ برس پہلے جماعت اسلامی کی تشکیل کا تخیل جس بنیاد پر پیدا ہوا تھا وہ یہ تھی کہ اُس وقت مسلمانوں میں جو تحریکیں اور جماعتیں کام کر رہی تھیں وہ اسلام کے نصب العین کو یا تو سمجھتی ہی نہ تھیں، یا اس کو سمجھنے اور اپنا حقیقی مقصود کہنے کے باوجود اُن راستوں پر چل رہی تھیں جو کسی طرح بھی اُس تک پہونچانے والے نہ ہو سکتے تھے۔ اس غلطی کو ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۱ء تک مسلسل اور پے در پے اُن مضامین میں واضح کیا گیا جو بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے نام سے شائع ہوئے، اور انہی مضامین میں یہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ بتایا گیا کہ اسلام کا اصلی نصب العین کیا ہے، اور اس کی طرف بڑھنے کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہی مضامین تھے جنہوں نے بالآخر ۱۹۴۱ء میں چند انسانوں کو جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک جماعت بنانے کے لیے اکٹھا کر دیا تاکہ وہ اُس نصب العین کے لیے اس خاص طریقے پر کام کریں۔ لہٰذا اِس جماعت کے مبدأ تخلیق کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ان مضامین کی طرف رجوع کرنا چاہیے، کیونکہ وہ اس کی پیدائش کے اصل محرک ہیں۔ ان میں اسلام کا نصب العین قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا گیا تھا:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے خواہ یہ کام مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

پھر اس کی تشریح یوں کی گئی تھی:

"الھُدٰی سے مراد دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ ہے۔ (یعنی یہ کہ) انفرادی برتاؤ، خاندانی نظام،

سوسائٹی کی ترکیب، معاشی معاملات، ملکی انتظام، سیاسی حکمت عملی، بین الاقوامی تعلقات، غرض زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کے لیے صحیح رویہ کیا ہونا چاہیے۔"

"دینِ حق یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی، خود اپنے نفس کی، اور تمام مخلوقات کی بندگی و اطاعت چھوڑ کر صرف اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرے اور اسی کی بندگی و اطاعت کرے۔"

"پوری جنسِ دین سے مراد یہ ہے کہ انسان انفرادی یا اجتماعی طور پر جن جن صورتوں سے کسی کی اطاعت کر رہا ہے وہ سب جنسِ دین کی مختلف انواع ہیں۔ بیٹے کا والدین کی اطاعت کرنا۔ بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا۔ نوکر کا آقا کی اطاعت کرنا۔ ماتحت کا افسر کی اطاعت کرنا۔ رعیت کا حکومت کی اطاعت کرنا۔ پیروں کا پیشواؤں اور لیڈروں کی اطاعت کرنا۔ یہ اور ایسی دوسری بے شمار اطاعتیں بحیثیتِ مجموعی ایک نظام اطاعت بناتی ہیں (جسے اس آیت میں الدین یا جنسِ دین کہا گیا ہے)"

"اللہ کی طرف سے رسول کے آنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ پورا نظام اطاعت اپنے تمام اجزا سمیت ایک بڑی اطاعت اور ایک بڑے قانون کے تحت ہو جائے۔ تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں۔ ان سب کو منضبط کرنے والا ایک اللہ ہی کا قانون ہو۔ اور اس بڑی اطاعت اور اس ضابطۂ قانون کی حدود سے باہر کوئی اطاعت باقی نہ رہ جائے۔"

"شرک کرنے والے وہ سب لوگ ہیں جو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ دوسری مستقل بالذات (یعنی خدا کی اطاعت سے آزاد) اطاعتیں شریک کرتے ہیں .... اللہ کے رسول پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کی مزاحمت کے باوجود اپنے مشن کو پورا کرے۔"

حصولِ نصب العین کا راستہ یہ تھا وہ نصب العین جسے پیش کر کے جماعت اسلامی کے قیام کی دعوت دی گئی تھی۔ اور اس تک پہونچنے کا راستہ جو پیش کیا گیا تھا وہ یہ تھا:

"اس نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے راہ راست وہی ہے جو اللہ کے رسول نے اختیار کی، یعنی یہ کہ لوگوں کو الہدیٰ اور دین حق کی طرف دعوت دی جائے۔ پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر کے اپنی بندگی و اطاعت اللہ کے لیے خالص کر دیں، دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت

کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں اور صرف اسی کے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنا لیں، ان کا ایک مضبوط جتھا بنایا جائے۔ پھر یہ جتھا تمام اُن اخلاقی، علمی اور مادی ذرائع سے جو اس کے امکان میں ہوں، دینِ حق کو قائم کرنے کے لیے جہادِ کبیر کرے یہاں تک کہ اللہ کے سوا دوسری اطاعتیں جن جن طاقتوں کے بل پر قائم ہیں اُن سب کا زور ٹوٹ جائے اور پورے نظامِ اطاعت پر وہی الہدیٰ اور دینِ حق غالب آجائے۔"

" اس راہِ راست کا ہر جزو قابلِ غور ہے۔ پہلا جزو یہ ہے کہ انسان کو بالعموم اللہ کی حاکمیت واقتدارِ اعلیٰ تسلیم کرنے اور اس کے بھیجے ہوئے قانون کو اپنی زندگی کا قانون بنانے کی دعوت دی جائے۔ یہ دعوت عام ہونی چاہیے۔ ہر وقت جاری رہنی چاہیے اور اس کے ساتھ دوسری غیر متعلق باتوں کی آمیزش نہ ہونی چاہیے۔ قوموں اور نسلوں اور ملکوں کے باہمی جھگڑے، خود اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کی بحثیں، غیر الٰہی نظامات میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایسے نظامِ فاسد کی خود غرضانہ حمایت کرنا، یا کسی نظامِ فاسد میں اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرنا، یہ سب چیزیں نہ صرف یہ کہ الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ میل نہیں کھاتیں بلکہ صریح طور پر اس کے منافی اور اس کے لیے مضرت رساں ہیں۔ پس جب کسی شخص یا گروہ کو دعوتِ حق کی خدمت انجام دینی ہو تو اسے ان تمام جھگڑوں اور بحثوں سے الگ ہو جانا چاہیے اور اپنی دعوت کے ساتھ کسی دوسرے غیر متعلق اور بے جوڑ قضیے کو شامل نہ کرنا چاہیے۔

دوسرا جزو یہ ہے کہ جتھا صرف ان لوگوں کا بنایا جائے جو اس دعوت کو جان کر اور سمجھ کر قبول کریں، جو بندگی و اطاعت کو فی الواقع اللہ کے لیے خالص کر دیں، جو دوسری اطاعتوں کو اللہ کی اطاعت کے ساتھ شریک کرنا چھوڑ دیں، اور حقیقت میں اللہ کے قانون کو اپنا قانونِ زندگی بنا لیں۔ رہے دوسرے لوگ جو اس طرزِ خیال یا طرزِ زندگی کے محض معترف ہوں، یا اس سے ہمدردی رکھتے ہوں، تو وہ مجاہدہ کرنے والے جتھے کے لیے رکن کیا معنی، رکنِ ثانی نہیں بن سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ جو جس درجے میں بھی اس کا ہمدرد یا بیرونی معاون بن جائے، بسا غنیمت ہے، مگر ارکان اور

ہمدردوں کے درمیان جو حقیقی فرق و امتیاز ہے اسے کسی حال میں بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔

تیسرا جزء یہ ہے کہ براہ راست غیر الٰہی نظام اطاعت پر حملہ کیا جائے۔ تمام کوششوں کا مقصود صرف اس ایک بات کو بنایا جائے کہ اللہ کی حاکمیت قائم ہو، اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کو مقصود بنا کر اس کے پیچھے قوتیں ضائع نہ کی جائیں۔" [1]

یہ طریق کار تھا جس پر اسلامی نصب العین کے لیے کام کرنے کی دعوت دی گئی تھی، اور اسی دعوت پر آخر کار یہ جماعت وجود میں آئی۔ مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ سوم کے آخر میں جو دستور جماعت درج ہے اس کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ "اسلام کا مقصد زندگی کے فاسد نظام کو بالکل بدل دینا ہے۔ یہ کلی و اساسی تغیر صرف اسی طریقے پر ممکن ہے جو انبیاء علیہم السلام نے اختیار کیا تھا۔ مسلمانوں میں اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اور جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ نہ اس مقصد کے لیے ہے اور نہ اس طریقے پر ہے۔ لہذا اب ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو صحیح معنوں میں اسلامی جماعت ہو اور اسلامی نصب العین کے لیے اسلامی طریقے پر کام کرے۔ اسی بنا پر شعبان ۱۳۶۰ھ (اگست ۱۹۴۱ء) میں ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا گیا جو صحیح اسلامی اصول پر کام کرنے کے خواہشمند ہیں اور باہمی مشورے سے "جماعتِ اسلامی" کی بنا ڈالی گئی۔"

دستورِ جماعت میں نصب العین کی تشریح	تشکیل جماعت کے ساتھ پہلے ہی اجتماع میں جو دستور وضع کیا گیا اس میں جماعت کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود

یہ قرار دیا گیا کہ "دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کا قیام، اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول"۔ پھر حکومتِ الٰہیہ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی کہ اس سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت نہیں بلکہ اس کی شرعی حکومت ہے، یعنی اُس قانون کی حکومت جو رسولوں کے واسطے سے آتا ہے، جس کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے۔ اور مومن کی زندگی کا مشن یہ بیان کیا گیا کہ "جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانونِ شرعی بھی عالمِ انسانی میں نافذ ہو۔" نیز یہ بھی صراحت

[1] مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم۔ مضمون "اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں"۔

کر دی گئی کہ یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے، لیکن جو لوگ ملک پر اپنے ناجائز یا لک بن بیٹھتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دستبردار نہیں ہو جایا کرتے، اس لیے مجبوراً مومن کو جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومتِ الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِّ راہ ہو اسے راستے سے ہٹا دے[1]

یہ دستور ۱۱ سال تک جماعتِ اسلامی کا دستور رہا۔ پھر اگست ۱۹۵۲ء میں جماعتِ اسلامی پاکستان نے اپنے لیے جو نیا دستور بنایا اس کی دفعہ ۴ میں وہی نصب العین ان الفاظ میں درج کیا گیا:

"عملاً اقامتِ دین (یعنی حکومتِ الٰہیہ، یا اسلامی نظامِ زندگی کا قیام) اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول" اور اس کی تشریح میں وہی مضمون جو سابق دستور میں تھا، یوں ادا کیا گیا:

"اقامتِ دین سے مقصود دین کے کسی خاص حصے کی اقامت نہیں ہے بلکہ پورے دین کی اقامت ہے، خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے، نماز روزے اور حج و زکوٰۃ سے ہو یا معیشت و معاشرت اور تمدن و سیاست سے۔ اسلام کا کوئی حصہ بھی غیر ضروری نہیں ہے۔ پورے کا پورا اسلام ضروری ہے۔ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اس پورے اسلام کو کسی تجزیہ و تقسیم کے بغیر قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ اس کے جس حصے کا تعلق افراد کی اپنی ذات سے ہے، ہر مومن کو اسے بطورِ خود اپنی زندگی میں قائم کرنا چاہیے۔ اور جس حصے کا قیام اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتا، اہلِ ایمان کو مل کر اس کے لیے جماعتی نظم اور سعی کا اہتمام کرنا چاہیے۔"

"اگرچہ مومن کا اصل مقصدِ زندگی رضائے الٰہی کا حصول اور آخرت کی فلاح ہے، مگر اس مقصد کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ دنیا میں خدا کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لیے مومن کا عملی نصب العین اقامتِ دین، اور حقیقی نصب العین رضائے الٰہی ہے جو اقامتِ دین کی سعی کے نتیجے میں حاصل ہوگی۔"

منشورِ جماعت میں نصب العین کی تشریح | دستور کے بعد ایک جماعت کی اہم ترین دستاویز اس کا

---

[1] پہلا دستورِ جماعت دفعہ ۲ مع تشریح۔

منشور ہوتا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں صوبائی انتخابات کے موقع پر جماعت اسلامی نے اپنا جو منشور شائع کیا تھا اس کے پہلے ہی صفحہ پر وہ اپنے مقصدِ وجود کو اس طرح پیش کرتی ہے:

"یہ جماعت اُن محدود معنوں میں کوئی سیاسی یا مذہبی یا اصلاحی جماعت نہیں ہے جن میں عام طور پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں، بلکہ یہ صحیح معنوں میں ایک اصولی جماعت ہے جو پوری انسانی زندگی کے لیے ایک جامع اور عالمگیر نظریۂ حیات پر یقین رکھتی ہے اور اپنے اس نظریہ کو انسانی عقائد و افکار میں، اخلاق اور عادات میں، علوم و فنون میں، ادب اور آرٹ میں، تمدن و تہذیب میں، مذہب اور معاشرت میں، معاشی معاملات میں، سیاست اور نظمِ مملکت میں، اور بین الاقوامی تعلقات و روابط میں عملاً نافذ کرنا چاہتی ہے۔ اس جماعت کے نزدیک دنیا کے بگاڑ کا حقیقی سبب خدا کی اطاعت سے انحراف، آخرت کی جواب دہی سے بے نیازی، اور انبیاء علیہم السلام کی رہنمائی سے روگردانی ہے ......

یہ جماعت نوعِ انسانی کے لیے فلاح کی صرف ایک ہی صورت دیکھتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا پورا نظام اپنے تمام شعبوں اور گوشوں سمیت خدائے واحد کی بندگی و اطاعت کے اصول پر قائم ہو، اس بندگی و اطاعت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی اس رہنمائی کو سند مانا جائے جو آج اپنی صحیح و کامل صورت میں صرف سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی میں موجود ہے، اور افراد کی سیرتوں سے لے کر قوموں کے اجتماعی طرزِ عمل تک ہر چیز کو اس اخلاقی روح پر قائم کیا جائے جس کی بنیاد آخرت کی جواب دہی کے احساس پر رکھی گئی ہو۔"

اجتماعاتِ عام میں نصب العین کی توضیحات دستور اور منشور کے بعد تیسری اہم ترین مستند توضیحات وہ ہیں جو ارکانِ جماعت کے عام اجتماعات میں کی جاتی ہیں، خواہ وہ کسی جماعتی قرارداد کی صورت میں ہوں یا خطبۂ امارت کی شکل میں۔ کیونکہ ایسے مواقع پر امیرِ جماعت جو کچھ کہتا ہے وہ کسی شخص کی ذاتی رائے نہیں ہوتی بلکہ پوری جماعت اسے سندِ قبول عطا کرتی ہے۔ میں آپ کے سامنے جماعت کی رودادوں سے نصب العین کی وہ توضیحات پیش کروں گا جو پچھلے اجتماعاتِ عام میں کی گئی ہیں۔

اولین اجتماع جس سے اس جماعت کے وجود کا آغاز ہوا، اس میں مقصدِ سعی یہ بیان کیا گیا تھا کہ دین کو

ایک تحریک کی صورت میں جاری کیا جائے۔" اور اس کی تشریح یہ کی گئی تھی کہ "ہماری زندگی میں دین داری محض ایک انفرادی رویے کی صورت میں جامد و ساکن ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ہم اجتماعی صورت میں نظامِ دینی کو عملاً نافذ و قائم کرنے اور مانع و مزاحم طاقتوں کو اس کے راستے سے ہٹانے کے لیے جدوجہد بھی کریں۔" آگے چل کر اسی سلسلے میں کہا گیا تھا:

"یہ بات ہر اُس شخص کو جو جماعتِ اسلامی میں آئے، اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو کام اس جماعت کے پیشِ نظر ہے وہ کوئی ہلکا اور آسان کام نہیں ہے۔ اسے دنیا کے پورے نظامِ زندگی کو بدلنا ہے۔ اسے دنیا کے اخلاق، سیاست، تمدن، معیشت، معاشرت ہر چیز کو بدل ڈالنا ہے۔ دنیا میں جو نظامِ حیات خدا سے بغاوت پر قائم ہے اُسے بدل کر خدا کی اطاعت پر قائم کرنا ہے اور اس کام میں تمام شیطانی طاقتوں سے اس کی جنگ ہے۔" [1]

۱۹۵۱ء کے اجتماع دارالاسلام میں "دعوتِ اسلامی اور اس کے طریقِ کار" کے عنوان پر ایک مفصل تقریر کی گئی تھی۔ اُس میں جماعتِ اسلامی کا مقصد یہ بیان ہوا تھا:

"ہمارے پیشِ نظر صرف ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی ـــــ انفرادی اور اجتماعی ـــــ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے، جس کے لیے اللہ نے اپنے انبیاء کو مبعوث کیا تھا، اور جس کی دعوت دینے اور جدوجہد کرنے کے لیے ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی امامت و رہنمائی میں امتِ مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہا ہے۔"

پھر اس دعوت کا خلاصہ حسبِ ذیل تین نکات کی شکل میں پیش کیا گیا تھا:

۱- یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں اُن کو بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔

۲- یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرے، یا اس کو ماننے کا دعویٰ اور اظہار کرے، اس کو ہم دعوت دیتے

[1] رودادِ اجتماعِ اول۔

ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے، اور جب وہ مسلمان ہے یا بنتا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔

۳۔ یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہ نمائی میں چل رہا ہے، اور معاملات دنیا کی زمام کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آگئی ہے، ہم دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہ نمائی و امامت، نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین صالحین کے ہاتھوں میں منتقل ہو۔

اس کے بعد ان تینوں نکات کی تشریح کی گئی تھی۔ اللہ کی بندگی، جس کی طرف دعوت دینا جماعت کا اولین کام بنایا گیا تھا، اُس کا مطلب ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا:

" انسان خدا کو پورے معنی میں الٰہ اور رب، معبود اور حاکم، آقا اور مالک، رہ نما اور قانون ساز، محاسب اور مجازی (جزا دینے والا) تسلیم کرے اور اپنی پوری زندگی کو، خواہ وہ شخصی ہو یا اجتماعی، اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی و سیاسی اور معاشی ہو یا علمی و نظری، اسی ایک خدا کی بندگی میں سپرد کر دے ...... بندگی حق کے اس مفہوم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم سچے دل سے یہ چاہیں کہ جو طریق زندگی، جو قانونِ حیات، جو اصول تمدن و اخلاق و معاشرت و سیاست، جو نظام فکر و عمل اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے واسطے سے ہمیں دیا ہے، ہماری زندگی کا پورا کاروبار اسی کی پیروی میں چلے اور ہم ایک لمحے کے لیے بھی، اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے شعبے کے اندر بھی، اس نظام حق کے خلاف کسی دوسرے نظام کے تسلّط کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہوں۔"

منافقت، جسے زندگی سے خارج کرنا جماعتِ اسلامی کی دعوت کا دوسرا نکتہ قرار دیا گیا تھا، اس کی تشریح یہ کی گئی تھی:

" منافقانہ رویے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی جس دین کی پیروی کا دعویٰ کرے اس کے بالکل برخلاف نظام زندگی کو اپنے اوپر حاوی و مسلّط پاکر راضی اور مطمئن رہے، اس کو بدل کر اپنے دین کو اس کی جگہ قائم کرنے کی کوئی سعی نہ کرے، بلکہ اس کے برعکس اسی فاسقانہ و باغیانہ نظام زندگی کو اپنے لیے سازگار بنانے اور اس میں اپنے لیے آرام کی جگہ پیدا کرنے کی فکر کرتا رہے، یا اگر اس کو بدلنے کی

کوشش بھی کرے تو اس کی غرض یہ نہ ہو کہ اس فاسقانہ نظامِ زندگی کی جگہ دینِ حق قائم ہو، بلکہ صرف یہ کوشش کرے کہ ایک فاسقانہ نظام ہٹ کر دوسرا فاسقانہ نظام اس کی جگہ قائم ہو جائے . . . .

. . . . ہمارا ایک نظامِ زندگی پہ ایمان رکھنا اور دوسرے نظامِ زندگی پر راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مخلصانہ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جس طریقِ زندگی پر ہم ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں . . . . ایمان تو اس میں کسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا، کجا کہ پورا کا پورا دین کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو، دین کے کچھ اجزا پر عمل ہوتا بھی ہو تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظامِ زندگی نے اس کو بے ضرر سمجھ کر رعایۃً باقی رکھا ہو، اور ان رعایات کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظامِ زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں، اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو، بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصولِ موضوعہ کے طور پر تسلیم کرکے سوچے! اس قسم کا ایمان چاہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو، لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

اس کے بعد تیسرے نکتے، یعنی انقلابِ امامت، یا انقلابِ قیادت کی توضیح کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

"ہمارا اپنے آپ کو بندگیِ رب کے حوالے کر دینا، اور اس حوالگی و سپردگی میں ہمارا منافق نہ ہونا بلکہ مخلص ہونا، اور پھر ہمارا اپنی زندگی کو تناقضات سے پاک کرکے مسلم حنیف بننے کی کوشش کرنا لازمی طور پر اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اُس نظامِ زندگی میں انقلاب چاہیں جو آج کفر و دہریت، فسق و فجور، اور بد اخلاقی کی بنیادوں پر چل رہا ہے، اور جس کے نقشے بنانے والے منکرین اور جس کا انتظام کرنے والے مدبرین سب کے سب خدا سے پھرے ہوئے اور اس کی شرائع کے قیود سے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ جب تک زمامِ کار ان لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی، جب تک علوم و فنون، آرٹ اور ادب، تعلیم و تدریس، نشر و اشاعت، قانون سازی اور تنفیذِ قانون، مالیات، صنعت و حرفت اور تجارت، انتظامِ ملکی اور تعلقات بین الاقوامی، ہر چیز کی باگ ڈور یہ سنبھالے رہیں گے،

کسی شخص کے لیے دنیا میں مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا اور خدا کی بندگی کو اپنا ضابطۂ حیات بنا کر رہنا نہ صرف عملاً محال ہے، بلکہ اپنی آئندہ نسلوں کو اعتقاداً بھی اسلام کا پیرو چھوڑ جانا غیر ممکن ہے۔"

"اس کے علاوہ صحیح معنوں میں جو شخص بندۂ رب ہو اس پر من جملہ دوسرے فرائض کے ایک اہم ترین فرض یہ بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ خدا کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو فساد سے پاک اور صلاح پر قائم کرے۔ اور ظاہر بات ہے کہ یہ مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک زمام کار صالحین کے ہاتھ میں نہ ہو۔ فساق و فجار اور خدا کے باغی اور شیطان کے مطیع دنیا کے امام و پیشوا اور منتظم بھی رہیں اور پھر دنیا میں ظلم و فساد اور بداخلاقی و گمراہی کا دور دورہ بھی نہ ہو، یہ عقل اور فطرت کے خلاف ہے اور آج تجربہ و مشاہدہ سے کالشمس فی النہار یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ایسا ہونا غیر ممکن ہے۔"

پھر جماعتِ اسلامی کی تنظیم کا مدعا اس طرح بیان کیا گیا تھا:

"ہماری دعوت صرف اسی حد تک نہیں ہے کہ دنیا کی زمام کار فساق و فجار کے ہاتھوں سے نکلے اور مومنینِ صالحین کے ہاتھوں میں آئے، بلکہ ایجاباً ہماری دعوت یہ ہے کہ اہلِ خیر و صلاح کا ایک ایسا گروہ منظّم کیا جائے جو نہ صرف اپنے ایمان میں پختہ، نہ صرف اپنے اسلام میں مخلص و یک رنگ، نہ صرف اپنے اخلاق میں صالح و پاکیزہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ اُن تمام اوصاف اور قابلیتوں سے بھی آراستہ ہو جو دنیا کی کارگاہِ حیات کو بہترین طریقے پر چلانے کے لیے ضروری ہیں، اور صرف آراستہ ہی نہ ہو بلکہ موجودہ کارفرماؤں اور کارکنوں سے ان اوصاف اور قابلیتوں میں اپنے آپ کو فائق تر ثابت کر دے۔" [1]

۱۹۴۵ء کے اسی اجتماع میں ایک دوسری تقریر بھی کی گئی تھی جو رُوداد جماعت حصہ سوم میں درج ہے، اور "تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں" کے نام سے الگ بھی شائع ہو چکی ہے۔ اس میں کہا

---

[1] رُوداد جماعت اسلامی حصہ سوم۔ یہ تقریر "دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات" میں بھی درج کی گئی ہے۔

گیا تھا کہ :

" ہماری جدو جہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہونچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فساق و فجار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو اور اس سعی و جہد کو ہم رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں .... دراصل فساق و فجار کی قیادت ہی نوعِ انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس پر ہے کہ دنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو .... اگر کوئی شخص دنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے، اضطراب کو امن سے، بد اخلاقیوں کو اخلاقِ صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہش مند ہو تو اس کے لیے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسنِ اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا فرض ہے کہ نوعِ انسانی میں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہونچائے جس سے تمدن کی زمام کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔"

" انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمام کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت میں چلا کرتی ہے جس میں ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہو، اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت میں جانے پر مجبور ہو جاتے ہیں جدھر گاڑی جا رہی ہو، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار جن کے ہاتھ میں ہو، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر، اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، ان کی رہ نمائی و فرماں روائی کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اُس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہ نما و فرماں روا اگر

خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، بُرے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہوں گے، بھلائیوں کو نشو و نما ہوگا اور بُرائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہ نمائی و قیادت اور فرماں روائی کا یہ اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بد اخلاقی پر چلے گا۔ خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات، عدل و قانون، سب کے سب بحیثیتِ مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشو و نما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں بُرائی کی راہ چلنا آسان اور بھلائی کی راہ چلنا کیا معنی اس پر قائم رہنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد خود اسی ملک کی تاریخ کو مثال میں پیش کر کے بتایا گیا تھا کہ جب انگریزوں کے ہاتھ میں زمامِ کار چلی گئی تو کس طرح ایک صدی کے اندر انہوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظامِ تمدن کو بدل کر رکھ دیا۔ خیالات و نظریات بدلے۔ مذاق اور مزاج بدلے۔ سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویے بدلے۔ تہذیب و اخلاق کے معیار اور قدر و قیمت کے پیمانے بدلے۔ زندگی کے طور طریقے اور معاملات کے ڈھنگ بدلے۔ غرض کوئی چیز ایسی نہ رہ گئی جو بدل نہ گئی ہو۔ اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ روز بروز پسپا، عاجز اور شکست خوردہ ہوتے چلے گئے جن کے ہاتھ میں زمامِ کار نہ تھی۔ حتیٰ کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں کی نسل سے وہ لوگ اُٹھنے لگے جنہیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان اور آخرت کے وقوع میں شک لاحق ہو گیا، اور انہوں نے اپنے آپ ہی کو نہیں، اپنی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی اُس تہذیب کے رنگ میں رنگ لیا جو اقتدار کے سرچشموں پر قابض ہو چکی تھی۔

اسی سلسلے میں یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ دین کا مقصود لوگوں سے اللہ کی اطاعت کرانا اور برائیوں کو مٹا کر بھلائیاں پھیلانا ہے، اور یہ مقصد ایسی حالت میں کبھی پورا نہیں ہو سکتا جب کہ نوعِ انسانی کی قیادت و رہ نمائی اور معاملاتِ انسانی کی سربراہ کاری ائمۂ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دینِ حق کے پیرو محض

ان کے ماتحت رہ کران کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یادِ خدا کرتے رہیں۔ اس لیے اسلام کے نقطۂ نظر سے امامتِ صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے۔ جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اُس کا کام صرف اتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، بلکہ عین اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کردے کہ زمامِ کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھوں میں منتقل ہو اور وہ نظامِ حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق دنیا کے انتظام کو درست کرے۔

یہی نصب العین، قریب قریب اسی تشریح کے ساتھ مئی ۱۹۴۷ء کے اجتماع دارالاسلام کی اُس تقریر میں پیش کیا گیا تھا جو "جماعتِ اسلامی کی دعوت" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں جماعتِ اسلامی کا مدعا واضح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ موجودہ تہذیب، جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے، دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے: لادینی، قوم پرستی اور جمہوریت۔ جماعتِ اسلامی جس مقصد کے لیے کام کر رہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ سارا نظامِ زندگی چلتا تو رہے انہی بنیادوں پر، مگر اس کے چلانے والے ہاتھ انگریز کے ہاتھ نہ رہیں بلکہ ہندستانی یا مسلمان قوم کے ہاتھ ہو جائیں۔ اس کے برعکس جماعتِ اسلامی یہ چاہتی ہے کہ اس پورے نظامِ زندگی کو ان بنیادوں سے اکھاڑ کر ان دوسری بنیادوں پر قائم کیا جائے: لادینی کے مقابلے میں خدا کی بندگی و اطاعت، قوم پرستی کے مقابلے میں انسانیت، اور جمہور کی حاکمیت کے مقابلے میں خدا کی حاکمیت اور جمہور کی خلافت۔ نیز یہ جماعت نظامِ زندگی کو چلانے والے ہاتھ بدلنا تو ضرور چاہتی ہے، مگر مغربی ہاتھوں کے بجائے مشرقی ہاتھ نہیں، غیرملکی ہاتھوں کے مقابلے میں ملکی ہاتھ بھی نہیں، بلکہ فاسق ہاتھوں کے مقابلے میں صالح ہاتھ۔ وہ چاہتی ہے کہ اس پورے نظامِ تمدن کی کارفرمائی اور اس کا انتظام اُن لوگوں کے سپرد ہو جو خدا سے ڈرنے والے، اس کی اطاعت کرنے والے، اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں۔ یہ نصب العین بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا تھا:

"موجودہ زمانے کی بے دین قومی جمہوریت تمہارے دین و ایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اِس کے آگے

تسلیم کرو گے تو قرآن سے پیٹھ پھیرو گے۔ اس کے قیام و بقا میں حصہ لو گے تو اپنے رسول سے غداری کرو گے۔ اس کا جھنڈا اُڑانے کے لیے اٹھو گے تو اپنے خدا کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کرو گے جس اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس ناپاک نظام کی روح سے، اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے، اور اس کا ہر جز اس کے ہر جز سے برسرِ جنگ ہے۔ اسلام اور یہ نظام کہیں ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام برسرِ اقتدار ہوگا وہاں اسلام نقش برآب رہے گا، اور جہاں اسلام برسرِ اقتدار ہوگا وہاں اس نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اُسی اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے تو تمھارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کی مزاحمت کرو اور اس کے مقابلے میں خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرو۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تم بحیثیت ایک قوم کے برسرِ اقتدار ہو وہاں تو اگر تمھارے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بجائے یہ کافرانہ نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمھاری اس مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے سے تم اس قدر بیزار ہو۔"

اس تقریر کا خاتمہ اِس اعلان پر ہوا تھا، اور یاد رکھیے کہ یہ اعلان امیر جماعت نے ارکانِ جماعت کے اجتماعِ عام میں کیا اور ارکان نے اس کو قبول کیا تھا کہ:

"اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے گا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے گا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہوگا۔ پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کرکے اُس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون مانتے ہیں۔"

رفقائے عزیز! یہ تھا وہ نصب العین جو اول روز سے جماعتِ اسلامی کے سامنے رکھا گیا تھا اور بار بار مختلف مواقع پر دہرایا جاتا رہا ہے۔ میں نے اس کو اتنی شرح و بسط کے ساتھ جماعت کے مستند مآخذ، اور ہر دور کے مآخذ سے اس لیے نقل کیا ہے کہ آپ کے سامنے اُس مقصد کی پوری تصویر اپنے تمام

گوشوں سمیت آجائے جس کے حصول کی جدوجہد کرنے کے لیے آپ اٹھے تھے۔ اب یہ آپ کا اپنا کام ہے کہ اس تصویر کو نگاہ میں رکھ کر اپنی جماعت کے پچھلے پانزدہ سالہ کام کو دیکھیں اور یہ رائے قائم کریں کہ آیا یہ کام اسی مقصد اور اسی نصب العین کی راہ میں تھا یا کسی اور چیز کی راہ میں۔ میں پوری دیانت کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ جماعتِ اسلامی من حیث الجماعت اپنے نصب العین کے صحیح اور مکمل شعور سے کبھی غافل نہیں ہوئی ہے، اور اس نے آج تک ایک ایک قدم خوب سوچ سمجھ کر ٹھیک اپنی منزلِ مقصود کی سمت میں اٹھایا ہے۔ وہ صاف ذہن کے ساتھ سمجھتی رہی ہے کہ اس کا مطلوب و مقصود کیا ہے، اور کھلی آنکھوں کے ساتھ دیکھتی رہی ہے کہ حالات و واقعات کے جنگل میں سے اُس کی منزلِ مقصود کی طرف جانے والا راستہ کون سا ہے۔ اُس کا حال اُن لوگوں کا سا نہیں رہا ہے جن کا ذہن اپنے مقصد کے فہم ہی میں الجھا ہوا ہوتا ہے اور وہ تاریکی میں اٹکل سے کسی طرف کو چل پڑتے ہیں، پھر چلتے چلتے بار بار ٹھیر کر سوچنے لگتے ہیں کہ ہم ٹھیک بھی جا رہے ہیں یا نہیں۔ یہ جماعت آسانی کے ساتھ اس حالت میں مبتلا نہیں ہو سکتی کہ پندرہ سال ایک راستے پر چلنے کے بعد یکایک اسے یہ شبہہ لاحق ہو جائے کہ ہم غلط سمت میں آگئے ہیں اور اب ہمیں الٹے پاؤں پھر کر کسی اور طرف چلنا چاہیے۔ اپنے عمل کی کوتاہیاں اور خامیاں تو وہ جانتی اور مانتی ہے اور ان کی تلافی کے لیے کوشش کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ لیکن اگر کوئی اسے اس بات کا قائل کرنا چاہے کہ وہ اپنے مقصد کے فہم ہی میں غلطی کر گئی ہے اور کسی غلط راستے پر پڑ گئی ہے تو اسے مضبوط دلائل کے ساتھ اُس کے فہم کی غلطی ثابت کرنی ہوگی اور یہ بھی دکھانا ہوگا کہ وہ صحیح راستہ کون سا تھا جسے چھوڑ کر جماعت غلط راستے پر آنکلی ہے۔

وہ اصول جن کے التزام کا عہد ہم نے کیا تھا

اب ایک نظر اُن اصولوں پر بھی ڈال لیجیے جن کے التزام کا ہم نے اقرار و اعلان کیا تھا۔ یہ اصول جماعت کے پرانے دستور میں عقیدہ، نصب العین اور نظامِ جماعت کے زیرِ عنوان درج تھے، اور جدید دستور میں ان کو عقیدہ، نصب العین، شرائط رکنیت اور فرائض رکنیت کے تحت درج کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جدید دستور کی دفعہ ۱۰ میں جماعت کا مستقل طریقِ کار یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

"(۱) وہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھے گی کہ خدا اور رسول کی ہدایت کیا ہے۔ دوسری ساری باتوں کو ثانوی حیثیت سے صرف اُس حد تک پیشِ نظر رکھے گی جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہوگی۔

(۲) اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے جماعت کبھی ایسے ذرائع اور طریقوں کو استعمال نہیں کرے گی جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں، یا جن سے فساد فی الارض رونما ہو۔

(۳) جماعت اپنے پیشِ نظر اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں سے کام کرے گی، یعنی یہ کہ تبلیغ و تلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعہ سے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور رائے عام کو اُن تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے جو جماعت کے پیشِ نظر ہیں۔

(۴) جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کے طرز پر نہیں کرے گی بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی۔"

ان اصولوں کو نگاہ میں رکھ کر آپ خود دیکھیں کہ پچھلے پندرہ سال کے دوران میں جماعت ان کی پابند رہی ہے یا نہیں۔ انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہرحال کوئی جماعت بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعت اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی ہے اور یہ سراسر اللہ کا فضل ہے کہ بے اصولی کے وہ انتہائی صبر آزما طوفان بھی جن کے درمیان اسے برسوں کام کرنا پڑا ہے، اسے ایک بے اصول جماعت بنا دینے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھتے ہیں۔ تدبیروں کا نام اصول نہیں ہے، اور دنیا کی کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو، ان کے لیے تو یہ ناگزیر بھی ہے اور دانائی کا تقاضا بھی کہ اگر ایک وقت انہوں نے ایک تدبیر کو صحیح و مناسب پا کر اختیار کیا ہو اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے، تو وہ بلا تامل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل دیں۔ اس ردّ و بدل کو اُس وقت تک اصول شکنی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا جب تک یہ

ثابت نہ کر دیا جائے کہ جن اصولوں کی پابندی کا ہم نے عہد کیا تھا ان کے حدود اربعہ میں اس ردّوبدل کی، یا ہماری اختیار کردہ کسی تدبیر کی گنجائش نہ تھی۔

نکتۂ دوم اب ہمیں قرارداد کے دوسرے نکتے پر غور کرنا ہے جس میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ جماعت کو آئندہ لائحۂ عمل وہی رہنا چاہیے جو نومبر ۵۱ء کے اجتماع کراچی میں پیش کیا گیا تھا، کیونکہ وہ بالکل صحیح توازن کے ساتھ مقصد تحریک کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ قبل اس کے کہ قرارداد کے اس جز کے متعلق آپ کوئی رائے قائم کریں، آپ کو دیکھنا چاہیے کہ وہ لائحہ عمل تھا کیا۔ ۱۹۵۱ء کے اجتماع میں اس کو کسی قرارداد کی شکل میں پیش نہیں کیا گیا تھا، بلکہ امیر جماعت نے اسے اپنی اس تقریر میں بیان کیا تھا جو "مسلمانوں کا ماضی و حال اور مستقبل کا لائحہ عمل" کے عنوان سے ایک مستقل پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی ہے۔

۱۹۵۱ء کا چار نکاتی لائحہ عمل اس پمفلٹ کے آخری حصے میں لائحہ عمل کے چار اجزا جس تشریح کے ساتھ بیان کیے گئے تھے ان کے ضروری اقتباسات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں:-

(۱) تطہیر افکار و تعمیر افکار

"ہم کئی سال سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور ہماری اس کوشش کا سلسلہ برابر جاری ہے کہ ایک طرف غیر اسلامی قدامت کے جنگل کو صاف کر کے اصلی اور حقیقی اسلام کی شاہراہ مستقیم کو نمایاں کیا جائے، دوسری طرف مغربی علوم و فنون اور نظام تہذیب و تمدن پر تنقید کر کے بتایا جائے کہ اس میں کیا کچھ غلط اور قابل ترک ہے اور کیا کچھ صحیح اور قابل اخذ، تیسری طرف وضاحت کے ساتھ یہ دکھایا جائے کہ اسلام کے اصولوں کو زمانۂ حال کے مسائل و معاملات پر منطبق کر کے ایک صالح تمدن کی تعمیر کس طرح ہو سکتی ہے اور اس میں ایک ایک شعبۂ زندگی کا نقشہ کیا ہوگا۔ اس طریقے سے ہم خیالات کو بدلنے اور ان کی تبدیلی سے زندگیوں کا رخ پھیرنے اور ذہنوں کو تعمیر نو کے لیے فکری غذا بہم پہنچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

(۲) صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت

"ہم ان آبادیوں میں اُن مردوں اور عورتوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو پرانی اور نئی خرابیوں سے پاک

ہوں، یا اب پاک ہونے کے لیے تیار ہوں۔ جن کے اندر اصلاح کا جذبہ موجود ہو۔ جو حق کو حق مان کر اس کے لیے وقت، مال اور محنت کی کچھ قربانی کرنے پر بھی آمادہ ہوں۔ خواہ وہ نئے تعلیم یافتہ ہوں یا پرانے۔ خواہ وہ عوام میں سے ہوں یا خواص میں سے۔ خواہ وہ غریب ہوں یا امیر یا متوسط۔ ایسے لوگ جہاں کہیں بھی ہیں، ہم انہیں گوشۂ عافیت سے نکال کر میدانِ سعی و عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ہمارے مقصد، طریقِ کار اور نظامِ جماعت کو قبول کرلیں تو انہیں اپنی جماعت کا رکن بنا لیتے ہیں۔ اور اگر وہ رکنیت کی شرائط پوری کیے بغیر صرف تائید و اتفاق پر اکتفا کریں تو ان کو اپنے حلقۂ متفقین میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں جو ایک بچا کھچا صالح عنصر موجود ہے، مگر منتشر ہونے کی وجہ سے یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوششیں کرنے کی وجہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کررہا ہے، اسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگایا جائے۔ ہم صرف اِس تنظیم ہی پر قناعت نہیں کررہے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ اِن منظم ہونے والوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت کا بھی انتظام کررہے ہیں تاکہ ان کی فکر زیادہ سے زیادہ سلجھی ہوئی، اور ان کی سیرت زیادہ سے زیادہ پاکیزہ، مضبوط اور قابلِ اعتماد ہو۔ ہمارے پیشِ نظر ابتدا سے یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام محض کاغذی نقشوں اور زبانی دعووں کے بل پر قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کے قیام اور نفاذ کا سارا انحصار اس پر ہے کہ آیا اس کی پشت پر تعمیری صلاحیتیں اور صالح انفرادی سیرتیں موجود ہیں یا نہیں۔ کاغذی نقشوں کی خامی تو اللہ کی توفیق سے علم اور تجربہ ہر وقت رفع کرسکتا ہے، لیکن صلاحیت اور صالحیت کا فقدان سرے سے کوئی عمارت اٹھا ہی نہیں سکتا، اور اٹھا بھی لے تو سہار نہیں سکتا۔"

(۳) اجتماعی اصلاح کی سعی

"اس میں سوسائٹی کے ہر طبقے کی اُس کے حالات کے لحاظ سے اصلاح شامل ہے۔ اور اس کا دائرہ اُتنا ہی وسیع ہوسکتا ہے جتنے ہمارے ذرائع وسیع ہوں۔ ہم اپنے ارکان اور کارکن متفقین کو ان کی ... صلاحیتوں کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں تقسیم کرتے ہیں اور ہر ایک کے سپرد وہ کام کرتے ہیں جس کے

لیے وہ اہل تر ہو ...... یہ سب اگرچہ اپنے الگ حلقہائے کار رکھتے ہیں، مگر سب کے سامنے ایک مقصد اور ایک اسکیم ہے جس کی طرف وہ قوم کے سارے طبقوں کو گھیر کر لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا متعین نصب العین یہ ہے کہ اُس ذہنی، اخلاقی اور عملی انارکی کو ختم کیا جائے، جو پرانے جمود اور نئے انفعالی رجحانات کی وجہ سے ساری قوم میں پھیلی ہوئی ہے، اور عوام سے لے کر خواص تک سب میں صحیح اسلامی فکر، اسلامی سیرت اور سچے مسلمانوں کی سی عملی زندگی پیدا کی جائے۔

...... اِس عمومی اصلاح کے پورے لائحۂ عمل کا بنیادی اصول یہ ہے کہ جو شخص جس حلقے اور طبقے میں بھی کام کرے، مسلسل اور منظم طریقے سے کرے اور اپنی سعی کو ایک نتیجے تک پہونچائے بغیر نہ چھوڑے۔ ہم اس کے قائل نہیں ہیں کہ ہوا کے پرندوں اور آندھی کے جھکڑوں کی طرح بیج پھینکتے چلے جائیں۔ اس کے برعکس ہم کسان کی طرح کام کرنا چاہتے ہیں جو ایک متعین رقبے کو لیتا ہے، پھر زمین کی تیاری سے لے کر فصل کی کٹائی تک مسلسل کام کر کے اپنی محنتوں کو ایک نتیجے تک پہونچا کر دم لیتا ہے۔ پہلے طریقے سے جنگل پیدا ہوتے ہیں اور دوسرے طریقے سے باقاعدہ کھیتیاں تیار ہوا کرتی ہیں۔"

(۴) نظامِ حکومت کی اصلاح

"ہم یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی کے موجودہ بگاڑ کو درست کرنے کی کوئی تدبیر بھی کامیاب نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اصلاح کی دوسری کوششوں کے ساتھ ساتھ نظامِ حکومت کو درست کرنے کی کوشش بھی نہ کی جائے۔ اس لیے کہ تعلیم اور قانون اور نظم و نسق اور تقسیم رزق کی طاقتوں کے بل پر جو بگاڑ اپنے اثرات پھیلا رہا ہو، اُس کے مقابلے میں بناؤ اور سنوار کی وہ تدبیریں جو صرف وعظ اور تلقین اور تبلیغ کے ذرائع پر منحصر ہوں، کبھی کارگر نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اگر ہم فی الواقع اپنے ملک کے نظامِ زندگی کو فسق و ضلالت کی راہ سے ہٹا کر دینِ حق کی صراطِ مستقیم پر چلانا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ بگاڑ کو مسندِ اقتدار سے ہٹانے اور بناؤ کو اس کی جگہ متمکن کرنے کی براہِ راست کوشش کریں۔ ظاہر ہے کہ اگر اہلِ خیر و صلاح کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو وہ تعلیم اور قانون اور نظم و نسق کی پالیسی کو تبدیل کر کے چند سال کے اندر وہ کچھ کر ڈالیں گے جو غیر سیاسی تدبیروں سے ایک صدی میں بھی نہیں ہو سکتا۔

"یہ تبدیلی کس طرح ہو سکتی ہے ؟ ایک جمہوری نظام میں اس کا راستہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے انتخابی جدوجہد۔ رائے عام کی تربیت کی جائے۔ عوام الناس کے معیارِ انتخاب کو بدلا جائے۔ انتخاب کے طریقوں کی اصلاح کی جائے اور پھر ایسے صالح لوگوں کو اقتدار کے مقام پر پہونچایا جائے جو ملک کے نظام کو خالص اسلام کی بنیادوں پر تعمیر کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں اور قابلیت بھی"۔ . . . .

"ہمیں اطمینان ہے کہ ہم اس طریقے سے مسلسل کام کر کے اپنے ملک کی پبلک کو بتدریج چند سال کے اندر کافی تربیت دے سکیں گے اور ہر نئے انتخاب کے موقع پر خود بخود پیمائش ہوتی چلی جائے گی کہ اس تربیت کے اثرات کو پبلک نے کس حد تک قبول کیا۔ ہو سکتا ہے کہ نظام حکومت کی واقعی تبدیلی میں ۲۵ سال صرف ہو جائیں، یا اس سے بھی زیادہ۔ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ تبدیلی کا صحیح راستہ یہی ہے، اور جو تبدیلی اس طریقے سے ہوگی وہ ان شاء اللہ پائیدار و مستحکم ہوگی"۔

لائحۂ عمل کی اہم خصوصیات یہ تھا وہ لائحۂ عمل جو ۱۹۵۱ء کے اجتماع میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ہر جزء کی تشریح میں جو کچھ اُس وقت کہا گیا تھا، اُس سے خود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کوئی نیا لائحۂ عمل نہ تھا جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۱ء ہی میں پیش کیا گیا ہو، بلکہ دراصل وہ پہلے سے جماعت کا لائحۂ عمل چلا آرہا تھا اور اس تقریر میں اسے صرف ایک ترتیب کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا تاکہ جماعت کے کارکن اور عام سامعین اُس اسکیم کو سمجھ سکیں جس پر جماعتِ اسلامی برسوں سے کام کر رہی تھی۔

اِس لائحۂ عمل کو اگر آپ اُس نصب العین کے ساتھ ملا کر دیکھیں جس کی تشریح ابھی میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں تو آپ بیک نظر محسوس کر لیں گے کہ یہ لائحۂ عمل اُس نصب العین کا فطری تقاضا ہے اور اِس کا ایک ایک جزء اُس کے ایک ایک گوشے پر ٹھیک ٹھیک منطبق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس جماعت کا وہ نصب العین ہو اس کا یہی لائحۂ عمل ہونا چاہیے اور یہی ہو سکتا ہے۔ اِس کے سوا اُس کا کوئی اور لائحۂ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

اِس کے چاروں اجزاء آپس میں ایسا منطقی ربط رکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کا تقاضا کرتا ہے۔ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے، اور جس کو بھی ساقط کر دیا جائے اس کے سقوط سے ساری اسکیم خراب ہو جاتی ہے۔ جماعت کے نصب العین کا حصول اگر ممکن ہے تو ان چاروں اجزاء پر بیک وقت متوازی کام، اور متوازن

طریقے پر کام کرنے ہی سے ممکن ہے۔ آپ اِس کے جس جز کو بھی الگ کر دیں گے، باقی اجزا کا کام نہ صرف کمزور اور بے اثر ہو جائے گا، بلکہ اپنے نصب العین کے لیے آپ کی جدوجہد ہی لاحاصل ہو کر رہ جائے گی۔

اس کا پہلا جز: اسلام کی خالص دعوت کو نکھار کر پیش کرتا ہے، اُس کی قبولیت کے لیے عوام اور خواص کو تیار کرتا ہے، اور اس کی کامیابی کے لیے ذہنی فضا ہموار کرتا ہے۔ یہ اس تحریک کا اوّلین بنیادی کام ہے جس کے بغیر آگے کے کسی کام کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

اِس کا دوسرا جز: دعوت قبول کرنے والوں کو منظّم کرتا ہے اور اُن کی قوتوں کو دعوت کی توسیع میں اور اس کی کامیابی کے لیے جدوجہد کرنے میں استعمال کرتا ہے۔ یہ جز پہلے جز کا لازمی تقاضا ہے۔ دعوت دینے کے ساتھ ساتھ اگر آپ دعوت قبول کرنے والوں کو منظّم نہ کرتے جائیں اور اُن کو دعوت کے مقاصد کی تحصیل کے لیے تیار نہ کرتے رہیں، اور انہیں عملاً اس کام میں لگاتے نہ چلے جائیں تو دعوت بجائے خود بے معنی ہو جاتی ہے۔ یہی کام تو اُس مشینری کو تیار کرتا ہے جو دعوت کو کامیاب بنانے کے لیے درکار ہے۔ آخر دعوت کا حاصل کیا ہے اگر آپ صرف پکارتے رہیں اور اُن لوگوں کو جو آپ کی پکار پر لبیک کہہ کر آئیں، اکٹھا کر کے کسی کام پر نہ لگائیں۔

اِس کا تیسرا جز: معاشرے کو اسلامی نظامِ زندگی کے لیے عملی اور اخلاقی حیثیت سے تیار کرتا ہے حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی الگ کام نہیں ہے جسے اِس پروگرام میں شامل کرنے یا نہ کرنے کا کوئی سوال پیدا ہو سکے۔ در اصل یہ اُسی کام کی تفصیل ہے جو لائحۂ عمل کے دوسرے جز میں بیان کیا گیا ہے۔ آپ دعوت قبول کرنے والوں کو منظّم کر کے اور تربیت دے کر جس کام میں لگائیں گے وہ معاشرے کی اصلاح ہی کا کام تو ہوگا۔ معاشرے کی اصلاح کا جتنا کام آپ کریں گے آپ کی دعوت وسیع ہوگی اور آپ کی تنظیم کے لیے مزید کارکن ملیں گے۔ اور آپ کی دعوت و تنظیم جتنی وسیع ہوگی اتنا ہی معاشرے کی اصلاح کا دائرہ پھیلتا جائے گا اور اسلامی نظامِ زندگی کے لیے زمین ہموار ہوتی چلی جائے گی۔ اِس طرح یہ دونوں اجزا بالکل ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ آپ کسی حال میں اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ اِن میں سے ایک آپ کے لائحۂ عمل میں شامل ہو اور دوسرا نہ ہو۔

اب چوتھے جز کو لیجیے۔ یہ چاہتا ہے کہ جیسے جیسے آپ کی دعوت مقبول ہو اور اس کے قبول کرنے والوں کی تنظیم قوت پکڑتی جائے اور معاشرہ اُس کے لیے تیار ہوتا جائے، اُسی نسبت سے آپ اسلامی نظامِ زندگی کو

عملاً برسر اقتدار لانے اور جاہلیت کی پشت پناہ طاقتوں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش کرتے چلے جائیں۔ اپنے اصل نصب العین کو نگاہ میں رکھ کر اگر آپ اس لائحۂ عمل کے پہلے تین اجزاء پر غور کریں گے تو یہ چوتھا جز اُن تینوں کا ایسا فطری تقاضا نظر آئے گا کہ اگر یہ آپ کے پروگرام میں شامل نہ ہو تو وہ تینوں سراسر بے معنی ہو جائیں گے۔ آخر آپ دعوت کس چیز کی دیتے ہیں؟ اسی چیز کی نا کہ اسلامی نظامِ زندگی قائم ہو۔ اِس دعوت کے قبول کرنے والوں کو منظم کرنے اور حرکت میں لانے سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ وہ اسلامی نظامِ زندگی کے قیام کی جدوجہد کریں۔ معاشرے کو آپ کس غرض کے لیے تیار کرتے ہیں؟ اِس کے سوا اور اس کی کیا غرض ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کے لیے زمین ہموار ہو۔ اب خود سوچیے کہ یہ سارے کام کرنے کا فائدہ کیا ہے اگر آپ ان کاموں سے حاصل ہونے والے نتائج کو اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ساتھ ساتھ استعمال نہ کرتے چلے جائیں۔ آپ کا اصل مقصد آخر کار جس کام کے ذریعہ سے حاصل ہونا ہے وہ یہی چوتھا کام ہی تو ہے۔ یہ آپ کے پروگرام میں شامل نہ ہو تو پہلے تین کام ایک سعی بے حاصل کے سوا کچھ نہ ہوں گے اور انہیں کر کے آپ زیادہ سے زیادہ بس مبلغوں کی ایک جماعت بن کر رہ جائیں گے جن کی پہلے بھی اس ملک میں کوئی کمی نہ تھی۔ اس طرح کی تبلیغ و تلقین اور اصلاحِ اخلاق کی کوششوں سے جاہلیت کا سیلاب نہ پہلے رُکا تھا نہ اب رُک سکتا ہے۔

اِس تجزیہ و تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس نتیجۂ مطلوب کے لیے جماعتِ اسلامی کی یہ ساری اسکیم بنائی گئی تھی وہ لائحۂ عمل کے ان چاروں اجزاء پر بیک وقت کام کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ اگر وہ نتیجہ فی الواقع آپ کو مطلوب ہے تو پھر اس پورے مرکب ہی پر آپ کو ایک ساتھ کام کرنا ہوگا۔ اس کے اجزاء کا باہمی ربط توڑ کر، یا اس میں کمی بیشی کر کے، یا ان میں سے بعض کو مقدم اور بعض کو مؤخر کر کے آپ اپنی تحریک کی ناکامی کے سوا اور کچھ حاصل نہ کریں گے۔

نکتۂ سوم | قرارداد کا تیسرا حصہ اس غلط فہمی کو رفع کرتا ہے کہ جماعت کا لائحۂ عمل پہلے شاید کچھ اور رہا ہو اور یہ چار نکاتی لائحۂ عمل کوئی نیا پروگرام ہو جو پہلی مرتبہ ۱۹۵۱ء میں پیش کیا گیا ہو۔ اس حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ جہاں تک اس پروگرام کے پہلے تین اجزاء کا تعلق ہے، یہ تو شروع ہی سے ہمارے لائحۂ عمل کے اجزائے لازم رہے ہیں اور اول روز سے جماعت اُن پر عمل کر رہی ہے۔

اِس بات کی تصدیق کے لیے میں آپ کو جماعت کے بالکل ابتدائی دور کی کارروائیوں کی طرف توجہ دلاؤنگا۔ سنہ ۱۹۴۱ میں تشکیل جماعت کے ساتھ پہلے ہی اجتماع میں اپنے کام کے لیے جو پروگرام ہم نے بنایا تھا وہ یہ تھا:-

"جماعت کا ابتدائی پروگرام اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) ان کو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیتِ رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اِس دعوت کی راہ میں جب تک کوئی قوت حائل نہ ہو، ان کو بھی چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدے کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔ بعد کے مراحل کے متعلق اِس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظام اطاعتِ غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرے دین (نظام اطاعتِ الٰہی) کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے[1]۔"

اسی اجتماع میں جماعت کے کام کو چار شعبوں (علمی و تعلیمی، نشر و اشاعت، تنظیم جماعت، اور دعوت و تبلیغ) میں تقسیم کر کے جو خدمات ہر شعبے کے سپرد کی گئی تھیں وہ قریب قریب اُسی نقشے پر تھیں جو دس سال بعد آپ کو سنہ ۱۹۵۱ کے لائحہ عمل میں نظر آ رہا ہے[2]۔ اور یہی نقشہ آپ مجلس شوریٰ کے اولین اجلاس (فروری سنہ ۴۲ء) کی تجاویز اور جماعت کے عارضی مرکز کی اسکیم (جولائی سنہ ۴۲ء) میں بھی پائیں گے[3]۔ اِن چیزوں کو دیکھ کر آپ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جماعت اسلامی ابتدا سے ایک سوچے سمجھے نقشے پر کام کر رہی ہے۔ اس نقشے کی تفصیلات تو ہمارے ذرائع و وسائل کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہیں، لیکن اس کے بنیادی خطوط وہی رہے ہیں جو اول روز سے اِس کام میں ہمارے پیش نظر تھے۔ اور اس یکسانیت کی وجہ یہ ہے کہ جس نصب العین کے لیے ہم کام کر رہے ہیں وہ اسی نقشۂ کار کا متقاضی ہے۔

نکتۂ چہارم | قرارداد کے چوتھے حصے میں یہ تجویز کیا گیا ہے کہ لائحۂ عمل کے پہلے تین اجزاء کے لیے فی الحال وہ پروگرام

[1] جماعت اسلامی کا پہلا دستور ص ۱۶ [2] روداد جماعت حصہ اول صفحہ ۱۹ تا ۲۴ [3] ایضاً صفحہ ۳۱ تا ۳۹

کافی ہے جو اس قرارداد کے ساتھ بطور ضمیمہ شامل کیا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھیے کہ جو ذرائع و وسائل اس وقت ہمیں میسر ہیں اُن کو دیکھتے ہوئے ہم سر دست اُس قدر کام اپنے ذمہ لے رہے ہیں جسے انجام دینے کی اِن وسائل کے ساتھ ہم توقع رکھتے ہیں۔ اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمارے وسائل میں اضافہ کر دے تب بھی ہم اِتنے ہی کام پر اکتفا کریں گے، یا موجودہ وسائل کے ساتھ اگر کوئی مزید خدمت بھی ہمارے لیے ممکن ہوئی جو اس پروگرام میں درج نہیں ہے، تو ہم اس سے منہ موڑ لیں گے۔

اب میں اس پروگرام کا تجزیہ کر کے بتاؤں گا کہ لائحۂ عمل کے ایک ایک جزء کے لیے اس میں کیا کچھ رکھا گیا ہے اور اُس کا منشا پورا کرنے کے لیے آپ کو کیا کچھ کرنا ہے۔

علمی و فکری میدان میں کام ہمارے لائحۂ عمل کا پہلا جز تطہیر افکار و تعمیر افکار ہے۔ یہ بجائے خود اتنا وسیع میدانِ کار ہے جس میں اگر ساری جماعت اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ اور اپنے وسائل کا ایک ایک حبّہ بھی صرف کر ڈالے تو اس کے کسی ایک گوشے کا بھی احاطہ نہیں کر سکتی۔ لیکن ہمیں بہرحال اپنی ساری طاقت ایک ہی میدان میں صرف نہیں کر دینی ہے بلکہ توازن کے ساتھ وہ سارے کام کرنے ہیں جو ہمارے نصب العین کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے علمی و فکری میدان کے مختلف گوشوں میں ہم نے صرف اہم ضروریات کو سامنے رکھ کر سنہ ۱۹۵۵ء کے اختتام تک کے لیے کام کا ایک منصوبہ بنایا ہے جو پانچ بڑے بڑے شعبوں پر مشتمل ہے:-

شعبۂ تعلیم۔ اس میں تین کام ہم نے اپنے ذمے لیے ہیں (۱) علوم دینی کی تعلیم کا ایسا انتظام جس سے جدید زمانے کی ضرورت کے مطابق علما تیار ہو سکیں۔ (۲) ابتدائی تعلیم کے ایسے مدارس کا قیام جن میں دینی تعلیم کا انتظام بھی ہو اور اخلاقی تربیت کا بھی۔ (۳) تعلیم بالغان کے ایسے مراکز کا قیام جہاں اَن پڑھ عوام کو خواندہ بنانے کے ساتھ اُن کو دین سے بھی واقف کرایا جائے اور اپنے طبقے کے دوسرے لوگوں کی اصلاح کا جذبہ بھی ان میں بیدار کیا جائے۔

شعبۂ تراجم۔ اس میں سابق کاموں کو جاری رکھتے ہوئے چار خاص کاموں کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ (۱) انگریزی زبان میں جماعت کے لٹریچر کا ترجمہ۔ (۲) بنگلہ زبان میں چند ایسی کتابوں کا ترجمہ جن کی مشرقی پاکستان میں

فوری ضرورت ہے۔ (۳) ایک بنگلہ پرچے کی اشاعت۔ (۴) اردو زبان میں اسلام کے متعلق ضروری کتابوں کے ترجمے کرانے کے لیے ایک ادارے کا قیام۔

شعبۂ نشر افکار۔ اس میں دارالمطالعوں کی توسیع کا پروگرام رکھا گیا ہے۔

شعبۂ تحقیقات علمی۔ اس میں ایک ایسے ادارے کا قیام تجویز کیا گیا ہے جو عمدہ ذہنی استعداد رکھنے والے نوجوانوں کو علمی تحقیقات کے لیے تیار کرے۔ اور جب تک ایسے ادارے کا قیام ممکن نہ ہو، اس وقت تک کے لیے کم سے کم یہ پروگرام بنایا گیا ہے کہ جماعت کے کارکنوں میں جو لوگ اچھی صلاحیتیں رکھتے ہیں انہیں دوسری سرگرمیوں سے فارغ کر کے مختلف شعبوں میں علمی کام پر لگایا جائے۔

شعبۂ خواتین۔ اس میں ایک ایسے ادارے کا قیام تجویز کیا گیا ہے جو عورتوں کے لیے لٹریچر بھی تیار کرے اور تعلیم و تربیت کی خدمت بھی انجام دے۔

توسیع جماعت اور اندرونی اصلاح لائحۂ عمل کا دوسرا جزء صالح افراد کی تلاش، تنظیم اور تربیت ہے۔ یہ کام در اصل نظام جماعت کی توسیع و استحکام کا کام ہے جسے ابتدا سے جماعت کرتی چلی آرہی ہے، اور آج ہماری جتنی کچھ بھی طاقت ہے اسی کام کی بدولت ہے۔ اب اس کے لیے جو پروگرام بنایا گیا ہے وہ دو حصوں پر مشتمل ہے:

پہلا حصہ توسیع جماعت کا ہے جس میں ۱۹۵۵ء کے اختتام تک متفقین کی تعداد مشرقی پاکستان میں دس ہزار اور مغربی پاکستان میں ۴۰ ہزار تک پہونچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ محض توسیع جماعت ہی کا کام نہیں ہے بلکہ توسیع دعوت اور نشر افکار اور اصلاح معاشرہ کا کام بھی ہے۔ اس لیے کہ جب تک آپ لاکھوں آدمیوں تک اپنا پیغام نہ پہونچائیں گے، ہزاروں آدمیوں کو متفق بنا کر جماعت سے منسلک نہ کر سکیں گے۔ اور جتنے آدمیوں کو آپ متفق بنائیں گے اتنے ہی اس معاشرے میں دعوت اسلامی سے ذہنی و اخلاقی طور پر متاثر ہونے والے پیدا کریں گے اور سب نہیں تو ان میں سے ایک کثیر تعداد ایسی بھی نکل آئے گی جو اصلاح عمومی کی خدمت کے لیے کارکن بن سکے گی۔

دوسرا حصہ جماعت کی اندرونی اصلاح اور کارکنوں کی تربیت سے متعلق ہے۔ اس حصے میں ہم نے اپنے تجربات کی بنا پر ان اسباب کو ٹھیک ٹھیک مشخص کیا ہے جو جماعت میں خرابیوں کی پیدائش کے موجب ہوتے ہیں، اور

اُن کا علاج تجویز کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک جماعت کے اندر خرابی پیدا ہونے کے چار بڑے سبب ہیں:۔
اول یہ کہ کارکنوں کے درمیان نزاعات رونما ہوں اور انہیں بر وقت رفع نہ کیا جائے۔
دوم یہ کہ کسی مقام یا علاقے میں کسی وجہ سے جماعت کا کام بگڑ رہا ہو، یا سست پڑ رہا ہو اور اس کی طرف فوراً توجہ نہ کی جائے۔
سوم یہ کہ ارکانِ جماعت کی اخلاقی و دینی حالت، اُن کے معاملات، اور نظمِ جماعت میں ان کے طرزِ عمل کا محاسبہ نہ ہوتا رہے، قابلِ اصلاح لوگوں کی اصلاح کے لیے کوشش نہ کی جائے، اور ناقابلِ اصلاح لوگوں کو جماعت سے خارج کرنے میں بے جا تساہل برتا جائے۔
چہارم یہ کہ جماعت کے کارکنوں کی تربیت کا مناسب انتظام نہ ہو، اور وہ اُس عقیدے اور فکر اور جذبے سے غافل ہوتے چلے جائیں جو تحریکِ اسلامی کے خادموں کو حرکت میں لانے والی اصل قوتِ محرکہ ہے۔
ہم نے جماعت کی اندرونی اصلاح کا جو پروگرام بنایا ہے وہ انہی چار اسباب کے علاج پر مرکوز کیا گیا ہے۔
جماعتِ اسلامی نے ارکان کی کمیت کو کبھی اہمیت نہیں دی ہے۔ اس کی نگاہ ہمیشہ ارکان کی کیفیت پر رہی ہے۔ وہ اس بات کی قائل ہے کہ خام آدمیوں کی ایک بھیڑ جمع کر لینے سے کچھ حاصل نہیں۔ ہمارے پاس چاہے مٹھی بھر آدمی ہی ہوں، لیکن اگر وہ سیرتِ صالحہ اور جذبۂ صادق رکھتے ہوں، نظم میں مضبوط اور عمل میں سرگرم ہوں، اور آپس میں بُنیان مرصوص کی طرح جُڑے ہوئے ہوں تو وہ اٹھ کر وقت کے سیلاب کا منہ موڑ سکتے ہیں اور واقعات کی رفتار کو اپنے عقیدے کے مطابق بدل جانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔
ہم اس بات کے بھی کبھی قائل نہیں رہے ہیں کہ اگر ہمارے ساتھ دو چار یا دس بیس فی صدی بے کار آدمی آ گئے ہوں، یا اب بے کار ہو گئے ہوں تو ہم اُن کی خاطر اپنی راہ کھوٹی کریں اور بیٹھ کر اپنے لائحۂ عمل پر نظرِ ثانی شروع کر دیں۔ ہم پہلے بھی سیکڑوں بے کار رسانیوں کو چھانٹ کر پھینک چکے ہیں اور اب بھی یہی کریں گے۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قافلے کو اپنے نصب العین کی طرف مسلسل پیش قدمی جاری رکھنی چاہیے۔ جو ساتھ چل سکتا ہو وہ چلے۔ اور جو نہ چل سکتا ہو وہ الگ ہو جائے۔ یا خود الگ نہ ہو تو الگ کر دیا جائے۔ درماندگانِ راہ کو سنبھالنے اور آگے لے چلنے کی کوشش تو ہم ضرور کریں گے، مگر ان کی خاطر اپنی راہ کھوٹی نہ کریں گے، اور نہ کوئی ایسا قدم اٹھانے سے باز رہیں گے جو

ہمارے مقصد کے لیے ضروری ہو۔

عوامی اصلاح و تربیت ہمارے لائحۂ عمل کا تیسرا جز اجتماعی اصلاح کی سعی ہے۔ یہ کام بھی جماعت ہر دور میں اپنی قوت و استعداد کے مطابق کرتی رہی ہے، اور جیسے جیسے ہمارے وسائل بڑھتے گئے ہیں، ہم اس کا دائرہ وسیع کرتے چلے گئے ہیں۔ اب اپنی موجودہ طاقت اور وسائل کو دیکھتے ہوئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ معاشرے کی ہمہ گیر اصلاح کا ایک پروگرام لے کر ہم چل سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں ہم نے اُن کاموں کا ذکر نہیں کیا ہے جو پہلے سے ہمارے مستقل شعبوں کی شکل میں کام کر رہے ہیں، مثلاً خدمتِ خلق اور شعبۂ محنت کاراں وغیرہ۔ بلکہ اس میں صرف عمومی اصلاح کے کاموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے یہ کام متفرق طور پر تھوڑے بہت کہیں کہیں ہو رہے تھے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ جماعت ایک منظم طریقے سے باقاعدہ ایک مہم کے طور پر ایک منصوبہ بنا کر انہیں چلائے اور جن جن علاقوں میں اس کو کارکن اور ذرائع میسر آتے جائیں وہاں ایک ترتیب کے ساتھ انہیں آگے بڑھاتی چلی جائے۔ اب ہر علاقے کی جماعتِ اسلامی کو ان کاموں کا حساب اپنے کارکنوں سے لینا اور اپنے اوپر کے نظم کو دینا ہوگا۔ اب انہیں خود بھی یہ دیکھنا ہوگا اور بالائی نظم کو بھی یہ دکھانا پڑے گا کہ کن کن بستیوں میں اس سلسلے کا کیا کام ہو رہا ہے اور کس تدریج و ترتیب کے ساتھ وہ دوسری بستیوں کی طرف پھیل رہا ہے۔

اس پروگرام میں سر دست حیاتِ اجتماعی کے مختلف گوشوں کے لیے کام کا جو نقشہ بنایا گیا ہے وہ یہ ہے:

مذہبی گوشے میں کارکنانِ جماعت کو یہ کام کرنے ہوں گے۔ (۱) عوام الناس کو اطاعتِ خدا و رسول کی طرف بلانا، ان میں آخرت کی بازپرس کا احساس بیدار کرنا، ان کو نیکی اور بھلائی کی تلقین کرنا، اور انہیں اسلام کی حقیقت سمجھانا۔ (۲) عام لوگوں کو اُن ضروری احکامِ دینی سے باخبر کرنا جن کا جاننا مسلمان کی سی زندگی بسر کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ (۳) مساجد کی حالت درست کرنا اور ان کے لیے مسلم معاشرے میں مرکزی اہمیت پیدا کرنا۔ (۴) مذہبی جھگڑوں کو روکنا اور لوگوں کو اس کشمکش کے نقصانات کا احساس دلانا۔

اخلاقی گوشے میں ہمارے کارکنوں کو تین کاموں پر اپنی قوت صرف کرنی ہوگی: (۱) غنڈہ گردی کا انسداد۔ (۲) ہر قسم کے فواحش کا انسداد۔ اور (۳) رشوت و خیانت کی روک تھام۔ ان اغراض کے لیے ہم صرف اخلاقی تلقین ہی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے، بلکہ معاشرے کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظم کر کے ان کے

خلاف عملی جدوجہد بھی کرنا چاہتے ہیں۔

معاشی گوشے میں ہم کوشش کریں گے کہ تین طرح کی خدمات انجام دی جائیں: (۱) توخذ من اغنیاءھم فترد علیٰ فقراءھم کے شرعی اصول پر بستیوں کے غریبوں، محتاجوں اور معذوروں کی باقاعدہ اعانت کا انتظام کیا جائے اور اس کے لیے انہی بستیوں کے ذی استطاعت لوگوں سے مدد لی جائے (۲) سرکاری محکموں اور اداروں سے عام لوگوں کی شکایات رفع کرائی جائیں، اور داد رسی حاصل کرنے کے معاملے میں جس حد تک ممکن ہو ان کی مدد کی جائے (۳) بستیوں کے لوگوں میں اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ وہ خود ہی مل جل کر اپنی بستیوں کی صفائی اور راستوں کی درستی اور حفظانِ صحت کا انتظام کر لیا کریں۔

تعلیمی گوشے میں ہماری کوشش یہ ہو گی کہ جگہ جگہ بستیوں اور محلوں میں دار المطالعے اور تعلیم بالغان کے مراکز قائم کیے جائیں۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں بستیوں کے لوگ مالی ذرائع فراہم کرنے پر تیار ہوں وہاں ایسے پرائمری اسکول قائم کرنا بھی اسی پروگرام کا ایک جزء ہے جن میں سرکاری نصاب پڑھانے کے ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی ہو۔

اس تفصیلی تجزیے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس پروگرام میں لائحۂ عمل کے ابتدائی تین اجزاء میں سے ہر ایک کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے موجودہ وسائل کے لحاظ سے یہ پروگرام نہ بہت ہلکا ہے نہ بہت بھاری۔ اسی لیے قرارداد میں اسے "کافی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تاہم اگر کوئی اور کام بھی ایسا ہو جو ہمارے نصب العین کے لیے ذہن ہموار کرنے، یا اس کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ضروری ہو اور ہمارے وسائل اس کے متحمل ہوں، تو ہم ہر وقت اِس پروگرام میں اس کا اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ اس پروگرام کی تفصیلات دیکھ کر بعض لوگوں پر یہ اثر بھی پڑے کہ یہ تو ایک بڑا لمبا چوڑا پروگرام بنا کر رکھ دیا گیا ہے جس پر عمل درآمد ہونا مشکل ہے۔ ایسا تاثر اگر کسی کا ہے تو درحقیقت یہ ایک سطحی تاثر ہے۔ اس کی مثال ایسی ہو کہ جیسے کوئی شخص کھانا پکانے کے عمل کی جزئیات و تفصیلات کاغذ پر پڑھ کر یا کسی کی زبان سے سُن کر ہول کھا جائے اور سمجھے کہ بھلا اتنے کام کون نمٹا سکتا ہے۔ حالانکہ کام کرنے والے ہاتھ روزانہ دو دو اور تین تین مرتبہ ان سارے کاموں کو نمٹاتے رہتے ہیں اور اپنے ایک ایک عمل میں ان بہت سی تفصیلات کو سمیٹتے چلے جاتے ہیں جو کاغذ پہ بکھری ہوئی بہت نظر آتی ہیں۔

(باقی)

رسائل و مسائل

دارالاسلام کی نئی تعریف

سوال۔ میرے دو سوال حاضر خدمت ہیں امید کہ تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں گے۔

۱۔ دارالکفر، دارالحرب اور دارالاسلام کی صحیح تعریف کیا ہے؟ دارالکفر اور دارالاسلام میں کس چیز کو ہم اصلی اور بنیادی فرق قرار دے سکتے ہیں؟ مجھے اس مسئلے میں تردد حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی ظلہ کی حسب ذیل عبارت سے ہوا ہے:۔

"اگر کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ کسی غیر مسلم جماعت کے ہاتھوں میں ہو، لیکن مسلمان بھی بہرحال اس اقتدار میں شریک ہوں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا احترام کیا جاتا ہو تو وہ ملک حضرت شاہ صاحب[1] کے نزدیک بے شبہ دارالاسلام ہوگا اور از روئے شرع مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ اس ملک کو اپنا ملک سمجھ کر اس کے لیے ہر نوع کی خیر خواہی اور خیر اندیشی کا معاملہ کریں۔" (نقش حیات جلد دوم صلا)

آپ اس مسئلے میں میری رہنمائی فرمائیں۔

۲۔ آیت وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ میں لفظ لعل آیا ہے جو شک کا کلمہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا قطعی علم ہے۔ پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟۔

جواب۔ آپ نے اپنا پہلا سوال مجھ سے کرنے کے بجائے مولانا حسین احمد صاحب ہی سے کیا ہوتا تو بہتر تھا۔ آپ ان سے پوچھیے کہ ہندوستان کی موجودہ حکومت میں مسلمان جس درجہ شریک ہیں اور ان کے مذہبی و دینی شعائر کا جیسا کچھ احترام کیا جاتا ہے اس سے تو بدرجہا زیادہ وہ انگریزی دور میں شریک حکومت تھے اور اس سے بہت زیادہ ان کے شعائر مذہبی کا احترام انگریزی دور میں ہو رہا تھا۔ اگر کسی کو اس سے انکار ہو تو انگریزی دور کے مسلم وزراء اور ایگزیکٹو کونسل کے مسلم ممبروں اور فوجی اور سول محکموں کے مسلم ملازموں کی تعداد کا موجودہ بھارتی حکومت کے ہر شعبے میں حصہ پانے والے مسلمانوں کی تعداد سے مقابلہ کر کے ہر وقت اسے قائل کیا جا سکتا ہے۔

[1] یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب۔

رہا شعائر مذہبی کا احترام تو موجودہ ہندو اقتدار کے دور میں مساجد کی جتنی بے حرمتی ہوئی ہے اس کا مقابلہ انگریزی دور سے کر کے دیکھ لیا جائے، اس دور میں مسلمانوں کی جان و مال اور ان کی عورتوں کی عصمت پر جتنے حملے ہوئے ہیں ان کا مقابلہ انگریزی دور کے ایسے ہی حملوں سے کر لیا جائے۔ اور اس دور میں مسلمانوں کے پرسنل لا کا جو حشر ہوا ہے اس کے مقابلے میں دیکھ لیا جائے کہ ڈیڑھ سو برس کے انگریزی دور میں اس پرسنل لا کا کیا حال رہا ہے۔ اب اگر "حضرت شاہ صاحب کی تعریف کے مطابق موجودہ بھارت بے شبہ دارالاسلام ہے" تو انگریزی دور کا ہندوستان کیوں نہ تھا؟ آپ مولانا سے صاف صاف وہ وجہ فرق و امتیاز پوچھیں جس کی بنا پر ان کو انگریزی دور کا ہندوستان تو دارالکفر نظر آتا تھا اور موجودہ ہندوستان دارالاسلام نظر آتا ہے۔ اس سوال کا جو جواب مولانا دیں، اس سے مجھے بھی مطلع فرمائیے تاکہ میں بھی اس نئی فقہی تحقیق سے فائدہ اٹھا سکوں۔ میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ موجودہ بھارت بھی اگر دارالاسلام ہے تو پھر دنیا میں کوئی ملک دارالکفر ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔

مولانا حسین احمد صاحب کے معتقدین چاہے کتنا ہی برا مانیں، مگر امر واقعہ یہ ہے کہ آج مولانا کی قیادت میں دیوبند اس مقام سے بھی بدرجہا زیادہ فروتر مقام پر کھڑا ہے جہاں انگریزی دور اقتدار کے آغاز میں علی گڑھ کھڑا ہوا تھا۔ سرسید اور چراغ علی اور محسن الملک وغیرہم نے انگریزی اقتدار کے ساتھ مصالحت کرنے میں اس منزل کا عشر عشیر بھی اختیار نہیں کیا تھا جو اب مولانا حسین احمد اور ان کے ہم خیال علماء نے ہندو اقتدار کے ساتھ مصالحت میں اختیار کیا ہے۔ ان نیچریوں نے اسلامی تصورات کو مسخ کرنے میں وہ جسارت کبھی نہ دکھائی تھی جس کا اظہار اب یہ سکہ بند علماء کر رہے ہیں اور غضب یہ ہے کہ اپنے ساتھ خاندان شاہ ولی اللہ اور اپنے دوسرے اکابر کو بھی لے ڈوبنا چاہتے ہیں تاکہ اپنے تقدس پر آنچ نہ آنے دیں۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ جن امور میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار تفویض کیا ہے، ان میں اللہ تعالیٰ انسان کی اصلاح کے لیے جو تدبیر اختیار فرماتا ہے اس سے نتیجہ مطلوب کا برآمد ہونا اس پر موقوف ہے کہ انسان اپنے اختیار کو صحیح استعمال کرے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ اسے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا اس لیے وہ اس نتیجہ مطلوب کے برآمد ہونے کا ذکر لعل کے ساتھ کرتا ہے۔ یعنی اس نتیجے کا برآمد ہونا یقینی نہیں ہے، بلکہ اگر انسان صحیح طرز فکر

اختیار کرے گا تب ہی یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ یہ نتیجہ رونما ہو۔

کیا تجارتی قرضوں پر سود جائز ہے ؟

سوال ۔ (۱) خاکسار نے جناب کی تصنیف "سود" کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں چند سوالات پیدا ہوئے ہیں اور گو میں نے کافی کاوش کی ہے تاہم ان کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں مل سکا۔ اس لیے اب آپ کو تکلیف دینے کی جرأت کرتا ہوں اور امید ہے کہ آپ از راہ کرم میری رہنمائی فرمائیں گے۔

(i) جناب نے اپنی کتاب کے حصہ اول (طبع سوم) کے صفحہ ۳۵ پر زمانہ جاہلیت کے "ربوٰ" کی جو مثالیں دی ہیں ان سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ آیا اس وقت کے لوگ تجارت کے لیے قرض لیتے تھے یا نہیں۔ جہاں تک میں معلوم کر سکا ہوں، کم از کم یورپ میں، قرض لے کر تجارت کرنا بہت بعد میں رواج میں آیا، اس سے پہلے تجارت نجی سرمایہ سے یا مضاربت کے ذریعہ ہوتی تھی۔ کیا جناب کسی ایسی مستند کتاب کا حوالہ عنایت فرمائیں گے جس سے معلوم ہو سکے کہ عرب میں تجارتی سود کا اس وقت رواج تھا کہ نہیں۔

(ii) اسی حصے کے صفحہ ۶۹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ربوا الفضل کی احادیث، تحریم سود کی آیت قرآنی (سورہ بقرہ) کے نزول سے پہلے کی ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ ربوا الفضل قرآنی حرمت اور قرآنی وعید کا حامل نہیں؟ یا بالفاظ سر سید احمد خاں صاحب "درحقیقت یہ معاملہ بیع فاسد کا ہے۔ اور ممنوع ربوا کی تفسیر میں داخل نہیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے"؟

امید ہے جناب والا میرے سوالات کا جواب عنایت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

جواب ۔ یہ بات کسی کتاب میں اس صراحت کے ساتھ تو نہیں لکھی گئی ہے کہ عرب جاہلیت میں "تجارتی سود" رائج تھا، لیکن اس امر کا ذکر ضرور ملتا ہے کہ مدینہ کے زراعت پیشہ لوگ یہودی سرمایہ داروں سے سود پر قرض لیا کرتے تھے، اور خود یہودیوں میں باہم بھی سودی لین دین ہوتا تھا۔ نیز قریش کے لوگ، جو زیادہ تر تجارت پیشہ تھے، باہم سود پر قرض لیتے دیتے تھے۔ قرض کی ضرورت لازماً صرف نادار آدمیوں ہی کو اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے پیش نہیں آتی، بلکہ زراعت پیشہ افراد کو اپنے زرعی کاموں کے لیے اور سوداگر لوگوں کو اپنے

کاروبار کے لیے بھی پیش آتی ہے، اور یہ آج کوئی نئی صورت نہیں ہے بلکہ قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ اسی چیز نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے وہ شکل اختیار کی ہے جو زمانہ جدید میں پائی جاتی ہے۔ قدیم صورت انفرادی لین دین تک محدود تھی، جدید صورت میں فرق صرف یہ ہوگیا کہ بڑے پیمانے پر قرض سے سرمایہ اکٹھا کرنے اور اسے کاروبار میں لگانے کا طریقہ رائج ہوگیا۔

ربٰو الفضل کی احادیث سورۂ بقرہ والی آیتِ حرمتِ سود سے تو پہلے کی ہیں اگر سورۂ آل عمران والی آیت کے بعد کی ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیت نے قرآن کا یہ منشا واضح کر دیا تھا کہ سود ایک برائی ہے جس کو بالآخر مٹانا پیشِ نظر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کے لیے ماحول تیار کرنے کی خاطر معاشی معاملات میں وہ اصلاحات فرمائی تھیں جن کے لیے ربٰو الفضل کا عنوان تجویز کیا گیا ہے۔ ان احادیث میں صاف طور پر لفظ ربٰو استعمال ہوا ہے۔ اور ممانعت کے الفاظ خود اس کی حرمت پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ قرآن میں جس سود کی حرمت کا حکم دیا گیا ہے وہ قرض والا سود ہے نہ کہ دست بدست لین دین والا سود۔ اور فقہا نے یہ تصریح بھی کی ہے کہ ربٰو الفضل بعینہ وہ ربٰو نہیں ہے جو قرآن میں حرام کیا گیا ہے، بلکہ یہ دراصل سود کا سدِّباب کرنے کے لیے ایک پیش بندی ہے جسے فقہی اصطلاح میں "سدِّباب ذریعہ" کہا جاتا ہے۔

سوال (۲) جناب نے جس تفصیل سے میرے سوالات کا جواب عنایت فرمایا ہے اس سے میری اس قدر حوصلہ افزائی ہوئی ہے کہ میں جناب کو دوبارہ تکلیف دینے کی جرأت کر رہا ہوں۔

قرآن کریم میں جس قدر سخت وعید ربٰو کے متعلق آئے ہیں شاید کسی اور گناہ کے لیے نہیں آئے۔ اس لیے میرے خیال ناقص میں علمائے کرام کو چاہیے کہ اس مسئلے میں قیاس سے کام نہ لیں اور جب تک سود کی کسی قسم کے متعلق ان کو یقین نہ ہو جائے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اُس قسم کا سود عام طور پر لوگوں میں متداول تھا اُس کو "الربٰو" کی تعریف میں شامل نہ کریں۔ جناب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب والا نے تجارتی سود کے رواج کی موجودگی کا قیاس مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر فرمایا ہے:۔

(۱) مدینہ کے زراعت پیشہ لوگ یہودی سرمایہ داروں سے سود پر قرض لیا کرتے تھے۔ میں باادب عرض کروں گا کہ ایسے قرض "تجارتی قرض" نہ کہلانے چاہییں۔ اس قسم کے قرض نادار اور حاجت مند لوگ لیا کرتے ہیں۔ زراعت

کے لیے "تجارتی قرض" زمانہ جدید کی ایجاد ہے۔ جب سے بڑے پیمانے پر زراعت اور اس کے لیے مشینری کا استعمال شروع ہوا زمینداروں کو "تجارتی قرض" لینے کی ضرورت ہوئی۔ زمانہ قدیم کے زراعت پیشہ لوگوں کے قرض مجبوری کے قرض ہوا کرتے تھے۔ اور ضروریات زندگی پورا کرنے کی غرض سے لیے جاتے تھے۔

(ii) خود یہودیوں میں باہم بھی سودی لین دین ہوتا تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے قرض تجارتی کاموں کے لیے ہوتے تھے۔ عرب کے یہود اکثر زراعت پیشہ تھے یا ساہوکار۔ جیسا کہ یورپ میں عرصہ تک ہوتا رہا ممکن ہے کہ عرب کے یہودی ساہوکار بھی غریب اور امیر دونوں قسم کے حاجت مندوں کو ان کی نجی ضروریات کے لیے روپیہ قرض دے کر اپنا کام چلاتے رہے ہوں۔

(iii) قریش کے لوگ جو زیادہ تر تجارت پیشہ تھے باہم سود پر قرض لیتے دیتے تھے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ قریش میں سود کی جو مثالیں میری نظر سے گزری ہیں ان سے اس بات کی وضاحت نہیں ہوتی کہ متعلقہ روپیہ تجارت کے لیے قرض لیا گیا تھا۔ اگر جناب کے مطالعہ میں کوئی ایسی مثال آئی ہو تو مہربانی فرما کر مطلع فرما دیں۔ تجارت اُن دنوں یا نجی سرمایہ سے یا مضاربت سے ہوتی تھی۔ جو تجارتی "کارواں" قریش بھیجتے تھے ان میں سب لوگ حصہ لے سکتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دینار اور نصف دینار تک بھی حصہ لیا جا سکتا تھا۔ بظاہر اس طریقے کی تجارت کے لیے روپیہ قرض لینے کی حاجت نہ ہونی چاہیے۔ جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں تجارتی سود یورپ میں بہت بعد میں آیا اور پانچویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیان اس کا وہاں رواج نہ تھا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ عرب کی بھی یہی حالت ہو۔ لیکن یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب میں تجارتی سود کے رواج کی موجودگی کو ماننے سے پہلے اس کے متعلق تحقیق کر لی جاوے۔ عربی اور دیگر مورخوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے حالات کافی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ تجارتی سود کے متعلق ان کی خاموشی سے کیا یہ گمان نہ ہوگا کہ ایسے سود کا اُن دنوں رواج ہی نہ تھا؟ خاص طور پر جب کہ تجارت کا طریق کار ہی ایسا تھا کہ اس میں ہر پیسے والا شامل ہو سکتا تھا۔

جناب کی نظر سے مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کا سورۂ بقرہ کی آیات ۲۷۶ و ۲۷۷ کا ترجمہ گزر چکا ہوگا۔ انہوں نے "الربوٰا" سے وہ سود مراد لیا ہے جو کسی حاجت مند سے لیا جاوے۔ کیا علمائے کرام اور مفسرین عظام

میں سے کسی اور نے بھی یہ معنے کیے ہیں؟ اگر ان معنوں سے اور بزرگانِ دین کو اتفاق ہو تو ایک بہت بڑے اور اہم مسئلے کا حل مل جائے گا۔

جواب۔ مجھے آپ کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ جس چیز کی حرمت کی تصریح قرآن میں نہ کی گئی ہو اس کو بعینہ اس چیز کے درجے میں نہ رکھنا چاہیے جس کے حرام ہونے کی صراحت قرآن میں کی گئی ہے۔ لیکن ربوا کے معاملہ پر اس قاعدے کا انطباق آپ جس طرح کر رہے ہیں وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ آپ کے استدلال کی بنیاد دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ ربوا سے مراد لازماً معاملہ قرض کی وہی صورت لی جانی چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج تھی۔ دوسرے یہ کہ تجارتی سود کا رواج چونکہ اس زمانے میں نہ تھا اور صرف نادار حاجت مند لوگ ہی سود پر قرض لیا کرتے تھے اس لیے صرف دوسری چیز ہی قرآنی حکم تحریم کی زد میں آتی ہے اور پہلی چیز اس سے خارج رہتی ہے۔ یہ دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔

پہلی بات اس لیے غلط ہے کہ قرآن صرف اُن معاملات کا حکم بیان کرنے نہیں آیا تھا جو نزول قرآن کے وقت عرب یا دنیا میں رائج تھے، بلکہ وہ اصول بیان کرنے آیا تھا جو قیامت تک پیش آنے والے معاملات میں جائز و ناجائز اور صحیح و غلط کا فرق ظاہر کریں۔ اگر یہ بات نہ مانی جائے تو پھر قرآن کے ابدی اور عالم گیر رہنما ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نیز اس صورت میں معاملہ صرف ایک ربوا کا نہیں رہتا۔ ایک شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ قرآن جس شراب کو حرام قرار دیتا ہے اس سے مراد صرف اس قسم کی شرابیں ہیں جو اُس وقت عرب میں بنا کرتی تھیں۔ قرآن جس سرقے کو حرام ٹھیرا رہا ہے اس سے مراد صرف اس طریقے یا اُن طریقوں سے سرقہ کرنا ہے جو اُس وقت استعمال ہوتے تھے۔ حالانکہ اصل چیز شراب اور سرقے کی حقیقت ہے جو ممنوع کی گئی ہے نہ کہ اس کی رائج الوقت قسمیں اور صورتیں۔ اسی طرح اصل چیز ربوا کی حقیقت ہے جو حرام کی گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ معاملہ قرض میں دائن مدیون سے اصل پر کچھ زائد وصول کرنے کی شرط کرے۔ یہ حقیقت جس معاملہ قرض میں بھی پائی جائے گی اُس پر قرآن کے حکم تحریم کا اطلاق ہو جائے گا۔ قرآن نے مطلق ربوا کو حرام کیا ہے اور کہیں یہ نہیں کہا کہ جو شخص ناداری و حاجت مندی کی حالت میں اپنی ضروریاتِ شخصی کی خاطر قرض لے صرف اس سے سود لینا حرام ہے۔

دوسری بات اس لیے غلط ہے کہ اول تو تجارتی سود کی صرف یہ شکل جدید ہے کہ تجارت کے لیے ابتدائی سرمایہ ہی قرض کے ذریعہ اکٹھا کیا جائے، ورنہ تجارتی کاروبار کے دوران میں تاجروں کا ایک دوسرے سے قرض لینا یا ساہوکاروں سے قرض لے کر کسی کاروباری ضرورت کو پورا کرنا تو قدیم ترین زمانے سے دنیا بھر میں رائج ہے اور اس کے جدید ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ دوسرے، شخصی حاجتوں کے لیے غیر تجارتی قرض لینے کی بھی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ آدمی بیماری میں دوا کا محتاج ہو یا مفلسی کی حالت میں گھر کے لیے آٹا دال فراہم کرنا چاہتا ہو اور اس کے لیے کسی مال دار سے قرض لے۔ اس کے علاوہ بہت سی صورتیں ایسی بھی ہیں جن میں بالکل نادار نہ ہونے کے باوجود آدمی قرض لے کر اپنی کوئی ذاتی ضرورت پوری کرتا ہے۔ مثلاً بچوں کی شادیاں کرنا، یا گھر بنانا۔ ایسے قرض بھی ہر زمانے میں لیے جاتے رہے ہیں۔ آپ قرض کی ان بہت سی مختلف صورتوں میں سے کس کس کو تحریم ربوا کے حکم سے خارج اور کس کس کو داخل کریں گے، اس کے لیے کیا اصول مقرر کریں گے: اور قرآن کے کن الفاظ سے یہ اصول نکالیں گے؟

زمانہ جاہلیت یا ابتدائی زمانہ اسلام کے کاروباری رواج میں تجارتی سود اور غیر تجارتی سود کی تفصیل نہ ملنے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں اس تفریق و امتیاز کا تصور پیدا نہ ہوا تھا اور یہ اصطلاحیں نہیں بنی تھیں۔ اُس زمانے کے لوگوں کی نگاہ میں قرض، ہر طرح کا، قرض ہی تھا، خواہ نادار لے یا مال دار، خواہ ذاتی ضروریات کے لیے لے یا کاروباری ضروریات کے لیے۔ اس لیے وہ صرف معاملہ قرض اور اس پر سود کے لین دین کا ذکر کرتے اور اس کی ان تفصیلات میں نہیں جاتے۔

مولانا آزاد کا صحیح منشا وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔ وہ اپنی تشریحی عبارتوں میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سود دینا اخلاقی حیثیت سے کیا قباحت ہے۔ لیکن ان کا منشا یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ سود سے مراد ہی صرف وہ سود ہے جو کسی حاجت مند کو ذاتی ضروریات کے لیے قرض دے کر وصول کیا جائے۔

مولانا موصوف کی تشریح سے جو مفہوم آپ اخذ کر رہے ہیں وہ قرآن کے الفاظ سے بھی زائد ہے اور مفسرین وفقہاء میں سے بھی کسی نے تحریم ربوا کے اس قرآنی حکم کو حاجت مندی سے مقید نہیں کیا ہے۔

اس سلسلے میں بہتر ہو کہ آپ میری تفسیر "تفہیم القرآن" جلد اول صفحہ ۲۱۰ سے ۲۱۸ تک ملاحظہ فرمالیں۔

نہیں ہے بلکہ ایک بداخلاقی ہے جسے کسی ایسی جماعت میں پھلنے پھولنے نہ دینا چاہیے جو اخلاقی بنیادوں ہی پر دنیا کی اصلاح کرنا چاہتی ہو۔

اس کا پہلا درجہ یہ ہے کہ آدمی کام نہ کرنے کے لیے جھوٹے عذرات اور بے بنیاد بہلنے پیش کرے۔ اس چیز سے چشم پوشی کرنا خود اُس شخص سے بھی بے وفائی ہے جس میں یہ اخلاقی عیب ابھرتا نظر آرہا ہو، اور اس جماعت سے بھی بے وفائی جس کے ساتھ بہت سے لوگوں نے ایک مقصدِ عظیم کی خاطر جان و مال کی بازی لگائی ہو۔ ایسی جماعت میں شریک ہونے والے ہر شخص کے اندر کم از کم اتنی اخلاقی جرأت اور ضمیر کی زندگی ہونی چاہیے کہ اگر اپنے جذبے کی کمزوری کے باعث وہ کام نہ کرے تو صاف صاف اپنی کمزوری کا اعتراف کرلے۔ اعتراف قصور کے ساتھ ایک شخص کا عمر بھر اس کمزوری میں مبتلا رہنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ وہ ایک مرتبہ بھی اس کو چھپانے کے لیے جھوٹے بہانوں سے مدد لے۔ یہ عیب جب بھی ظاہر ہو اس پر سرزنش ہونی چاہیے اور کبھی اس کی ہمت افزائی نہ کی جانی چاہیے۔ علیحدگی میں سرزنش کرنے پر وہ اس طریقے سے باز نہ آئے تو علانیہ جماعت میں اسے ملامت کی جائے اور اُن عذرات کی حقیقت کھول دی جائے جنہیں وہ اپنے لیے حجت بنارہا ہو۔ اس میں تساہل برتنے کے معنی یہ ہیں کہ جماعت کے اندر اُن خرابیوں کا دروازہ کھول دیا جائے جن کی تفصیل ہم ابھی اوپر بیان کر آئے ہیں۔

اس کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک کوتاہ عمل اور سست کار آدمی اپنی اس حالت کے لیے جماعت کے افراد کی کمزوریوں اور جماعت کے کام اور نظام کی خامیوں کو ذمہ دار ٹھیرائے اور انہیں اپنی بددلی کا سبب قرار دے۔ یہ درحقیقت خطرے کی سرخ جھنڈی ہے جو اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اب یہ شخص فتنہ پردازی کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر اس سے بددلی کے اسباب کی تفصیل پوچھنا غلط ہے۔ یہ سوال اس سے کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اُسے اُس فتنے کے راستے پر چلا دیا جائے جس کے سرے پر ابھی وہ پہونچا ہے۔ یہاں اُسے عیب چینی کا اذنِ عام دینے کے بجائے اُس کے دوستوں کو اُسے خدا سے ڈرانا چاہیے اور اس کو شرم دلانی چاہیے کہ خود ایک ناقص کارنامہ اور خام کردار لے کر وہ کس منہ سے دوسروں پر تنقید کی جسارت کر رہا ہے۔ محنت کرنے والے، خدمت میں سرگرمی دکھلانے والے، وقت اور مال کا ایثار دکھانے والے اگر تیری کوتاہی عمل کو اپنے لیے بددلی کا موجب ٹھیرائیں تو حق

بجانب ہوں گے۔ مگر تو کہاں بددلی کا روپ دھارنے چلا ہے جب کہ بددل کہنے والی خرابیوں کو پیدا کرنے میں تیرا اپنا حصہ دوسروں سے بڑھ کر ہے اور کام خراب کرنے میں تیرا اپنا عمل دوسروں کے لیے نظیر بن رہا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اپنی تمام کمزوریاں اور خامیاں جماعت کے علم میں ضرور آنی چاہییں، اور جماعت کو کبھی اُن کے جاننے سے کترانا اور ان کی اصلاح کی سعی سے منہ موڑنا نہ چاہیے۔ لیکن انہیں بیان کرنا جماعت کے اُن سرگرم خادموں کا کام ہے جو سب سے بڑھ کر خدمت میں جان لڑانے والے ہوں۔ وہی اس کا حق رکھتے ہیں، اور وہی ایمان داری کے ساتھ صحیح تنقید کر بھی سکتے ہیں۔ کسی اخلاقی تحریک میں اِس بے حیائی کی ہمت افزائی نہ کی جانی چاہیے کہ کام چور لوگ جو خدمت میں سست اور کردار میں خام ہوں وہ لمبی زبان لے کر جماعت کی خامیاں اور کمزوریاں بیان کرنے لگیں۔ ایسی تحریک میں اُن کا صحیح مقام شرمندگی و ندامت اور اعترافِ تصور کا ہے، ناقد اور مصلح کا نہیں ہے۔ اس مقام پر اگر وہ خود آکھڑے ہوں تو یہ سخت اخلاقی بیماری کی علامت ہے، اور اگر جماعت میں اُن کے لیے یہ مقام تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جماعت پر اخلاقی دیوالیہ پن مسلط ہو رہا ہے۔

اِس سلسلے میں یہ اصولی بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ ایک محرک و متحرک جماعت کے لیے اُس کے تندرست اعضاء کے احساسات کچھ اور معنی رکھتے ہیں اور بیمار اعضاء کے احساسات کچھ اور معنی۔ اس کے تندرست اعضاء وہ ہیں جو اپنے کام کی دُھن میں لگے ہوئے ہوں، اپنا تن من دھن سب کچھ انہوں نے اس کام میں لگا دیا ہو، اور جن کا نامۂ عمل یہ بتا رہا ہو کہ وہ اپنی حدِ استطاعت تک خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کر رہے ہیں۔ بیمار اعضاء وہ ہیں جنہوں نے کبھی اپنی حدِ وسع کے مطابق خدمت کا حق ادا نہ کیا ہو، یا جو کچھ مدت سرگرم رہنے کے بعد ٹھنڈے پڑ چکے ہوں، اور جن کا نامۂ عمل اُن کی کوتاہیوں کا صریح ثبوت دے رہا ہو۔ ان دونوں کے احساسات میں وہی فرق ہے جو تندرست آنکھ اور بیمار آنکھ کی بینائی میں ہوتا ہے۔ جماعت اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا اگر صحیح اندازہ کر سکتی ہے تو صرف اپنے تندرست اعضاء ہی کے احساسات کے واسطے سے کر سکتی ہے۔ رہے وہ اعضاء جو کام نہ کر رہے ہوں اور کام چھوڑنے کے لیے اپنی بددلی کا خود اظہار کر رہے ہوں، کبھی اس کا قابلِ اعتماد واسطہ نہیں بن سکتے۔ ان کے احساسات اگر سو فی صدی نہیں تو ۸۰-۹۰ فی صدی گمراہ کن ہوں گے، اور جو جماعت خودکشی

نہ کرنا چاہتی ہو وہ ہرگز ان کے دیے ہوئے احساسات پر اپنے نتائج کی بنا نہیں رکھ سکتی۔ یہ خیال کرنا کہ کمزوریاں اور خامیاں جو بھی سامنے لاکر رکھ دے، بس گڑگڑا کر ہمیں اُن کے آگے توبہ و استغفار شروع کردینی چاہیے، اور پھر انہی پر اپنے اندازوں کی بنا رکھ کر یہ بھی فیصلہ کر ڈالنا چاہیے کہ ہم کیا کچھ کرنے کے قابل ہیں اور کیا کچھ کرنے کے قابل نہیں ہیں، نیکی ہو تو ہو، مگر عقل مندوں کی نہیں، سادہ لوح اور مغفّل لوگوں کی نیکی ہے، اور دنیا میں اس طرح کے نیک لوگوں نے نہ پہلے کچھ بنایا ہے نہ اب کچھ بنا سکتے ہیں۔ اپنے کمال کے زعم میں مبتلا ہوجانا جتنی بڑی نادانی ہے اُس سے کچھ کم نادانی یہ نہیں ہے کہ اپنے نقص اور اپنی قوتِ کار کا اندازہ ہر کس و ناکس کے بیان پر کر ڈالا جائے اور یہ نہ دیکھا جائے کہ بیان کرنے والا کس حد تک صحیح صورتِ حال سمجھنے اور بیان کرنے کا اہل ہے۔

ایک اور بات جو اس مقام پر خوب سمجھ لینے کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک مقصد کے لیے کام کرنے والی جماعت کو اپنے سامنے اخلاق اور صلاحیتِ کار کے دو معیار رکھنے ہوتے ہیں۔ ایک معیارِ مطلوب، یعنی وہ انتہائی بلند معیار جس تک پہنچنے کی مسلسل جد و جہد جاری رہنی چاہیے۔ دوسرا کم سے کم قابلِ عمل ہونے کا معیار (Workable minimum) جس کو لے کر کام چلایا جاسکتا ہو، اور جس سے نیچے گر جانا قابلِ برداشت نہ ہو۔ ان دونوں قسم کے معیاروں کے معاملے میں مختلف ذہنوں کے لوگ مختلف طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔

ایک ذہن اصل مقصد کے لیے کام کرنے کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ کام بنے یا بگڑے یا بالکل ختم ہو جائے، یہ اس کے لیے کوئی زندگی و موت کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ اس کام کو چھوڑ کر بھی مزے سے جی سکتا ہے، اور کام میں شریک رہ کر بھی اس طرح شرکت کرسکتا ہے کہ اس کے وقت، مال اور قوتوں کو جونک نہ لگنے پائے۔ یہ ذہن بسا اوقات فکر و نظر کی عیاشی کے طور پر، اور کبھی اپنے فرار کے لیے پُرفریب معذرت کے طور پر، اخلاق کے آسمانوں پر اُڑتا ہے اور معیارِ مطلوب سے کم پر کسی طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس سے کم جو کچھ بھی نظر آتا ہے اس پر وہ بڑی بے چینی اور بے دلی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ بے چینی کام کے لیے نہیں بلکہ کام سے فرار کے لیے ہوتی ہے، خواہ یہ فراری ذہنیت شعوری ہو یا غیر شعوری۔

دوسرا ذہن اگرچہ مقصد اور اس کے لیے کام کرنے کو بڑی اہمیت، بلکہ پوری اہمیت دیتا ہے، مگر تخیل پرستی میں مبتلا ہونے کی وجہ سے معیارِ مطلوب اور کم سے کم قابلِ عمل ہونے کے معیار کا فرق ٹھیک ٹھیک ملحوظ نہیں رکھتا

یہ خود بھی بار بار الجھن میں پڑتا ہے، اور پہلی قسم کے ذہن کی چھوت بڑی آسانی سے اس کو لگ جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بھی پریشان کرتا ہے اور کام کرنے والوں کے لیے بھی اچھی خاصی پریشانیوں کا موجب بن جاتا ہے۔

تیسرا ذہن وہ ہوتا ہے جسے مقصد کے لیے کام کرنا اور کام چلانا ہوتا ہے، اور جسے اس کام کے بناؤ اور بگاڑ کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اسے اُس کا مقام خود ہی اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہر وقت دونوں قسم کے معیاروں کا ٹھیک ٹھیک فرق ملحوظ رکھتے ہوئے کام کرے، اور یہ دیکھتا رہے کہ مقصد کی طرف پیش قدمی کی رفتار کسی معقول اور وزنی سبب کے بغیر متاثر نہ ہونے پائے۔ وہ معیارِ مطلوب کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اس تک پہونچنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں ہوتا، اُس سے گری ہوئی ہر چیز پر سخت تشویش محسوس کرتا ہے، مگر کم سے کم قابلِ عمل معیار سے کام چلاتا رہتا ہے، اور اس معیار سے گر جانے والے لوگوں کی وجہ سے اپنی اسکیم بدلنے کے بجائے انہیں ہٹا کر پھینک دینا زیادہ پسند کرتا ہے۔ اس کے لیے اپنی طاقت کا صحیح اندازہ لگانا اور اس کے مطابق کام کے پھیلاؤ اور اس کی رفتار میں کمی بیشی کرنا بے شک ضروری ہے۔ اس میں وہ غلطی کر جائے تو اپنے مقصد کو نقصان پہونچا دے۔ لیکن سخت نادان ہوگا وہ شخص جو اس چیز کا اندازہ لگانے میں پہلی اور دوسری قسم کے ذہنوں سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس کے لیے اگر مددگار ہو سکتے ہیں تو تیسری قسم کے ذہن ہی ہو سکتے ہیں، اور ان کی معرفت اسے حاصل ہونی چاہیے۔

مطبوعات

تعارف القرآن | از جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی، الٰہ آباد یونیورسٹی۔ مصنف (محلہ شاہ گنج، الٰہ آباد)، کتابستان، الٰہ آباد اور اسرار کریمی پریس الٰہ آباد سے مل سکتی ہے۔ قیمت عہ

یہ کتاب اپنے نام کے مطابق فی الحقیقت قرآن کا خاصا وسیع تعارف کرا دیتی ہے۔ مؤلف نے اسے اتقان سیوطی کے طرز پر کسی قدر اجمال سے لکھا ہے۔ بہت سے عنوانات ہیں جن میں قرآن کے مندرجات و موضوعات اور متعلقہ تفسیری مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں۔ چھوٹی سی کتاب ابتدائی حد تک بڑی کافی معلومات فراہم کرتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا طرزِ نگارش بہت ہی صاف اور مضبوط ہے۔ کتاب کا کمزور پہلو یہ ہے کہ اس میں جابجا ایسی تفسیری روایات درج ہیں جو بجائے خود بحث و نظر کی محتاج ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ ایک قابلِ قدر کام ہے۔

مینا بازار | تصنیف: ملا نور الدین محمد ظہوری۔ ترتیب و تشریح: جناب ڈاکٹر محمد احمد صدیقی بی اے آنرز۔ استاد عربی و فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی۔

ملنے کا پتہ: اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، یوپی، انڈیا۔ قیمت ۸

یہ ایک فارسی کتاب ہے جس میں تھوڑی سی تاریخی اہمیت بھی ہے، لیکن فی الحقیقت یہ ایک معیاری ادبی نگارش ہے۔ اس کا اصل نام "زنانہ بازار" ہے۔ سجع و قافیہ کی موزونیت، تراکیب کی جدت و ندرت، تشبیہ و استعارہ کی لطافت اور علو و نزاکتِ خیال اس تحریر کی خصوصیات ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے یہ مغلیہ ثقافت کے ایک ایسے گوشے کو نمایاں کرتی ہے جس میں آنے والے دورِ زوال کی پرچھائیں پڑ رہی تھی۔ مینا بازار اکبر کی اختراع ہے۔ محل کی بیگمات اور اہلِ دربار کی پردہ نشین خواتین جمع ہوتیں۔ عورتیں ہی دکانیں اور خوانچے لگاتیں اور عورتیں ہی پہرہ و انتظام کی ذمہ دار ہوتیں لیکن بادشاہ اور محل کے شہزادوں پر بھلا کیا قدغن ہو سکتی تھی۔ بقول

صاحبِ آئینِ اکبری دور میں بادشاہ بھی نقاب ڈال کر پہنچ جاتے"۔ شہزادہ سلیم کے معاشقہ کے لیے یہی بازار شہادت گاہِ قلب و نظر ثابت ہوا۔

اس فارسی کتاب کو ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی نے نصابی ضروریات کے مطابق باقاعدہ ایڈٹ کیا ہے۔ فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے، کتاب کا تعارف خاصے تحقیقی انداز سے کرایا ہے، خصوصاً مناسب حد تک یہ بحث بھی پیش کر دی ہے کہ میر واضح کے مقابلے میں ظہوری کو اس کا مصنف کیوں ماننا پڑتا ہے۔ کتاب کا نصف سے زائد حصہ شرحِ الفاظ و عبارت (NOTES) کے لیے وقف ہے۔ یہ تشریحی نوٹ نہایت اچھی زبان میں لکھے گئے ہیں اور عبارات کی پیچیدگیوں کو بہت ہی خوبی سے کھولا گیا ہے۔ طلبہ ہی کے لیے نہیں جملہ اصحابِ ذوق کے لیے ڈاکٹر صاحب کا کام افادیت رکھتا ہے۔ طباعتی معیار بہت اچھا ہے۔

سراپائے رسولؐ | تالیف: جناب اعجاز الحق قدوسی۔ ناشر: مکتبہ فلاحِ انسانیت، کراچی، قیمت ۲/۵۰

یہ کتاب موضوع اور انداز بیان کے لحاظ سے ایسی کتابوں میں سے ایک ہے جن کو ہر گھر میں رہنا چاہیے اور مردوں، عورتوں، نوجوانوں اور بچوں سب کی نگاہوں سے گزرنا چاہیے۔ اس میں دنیا کے بہترین انسان، معیار انسانیت ــ کا سراپا اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس مقدس شخصیت کی ایک تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ذرا مؤلف کا جذبہ دیکھیے کہ: "یہ میری زندگی کا حاصل ہے، یہ میری عقیدت کے پھول ہیں، یہ میرے ایمان کی روح ہے جس کو گنبدِ خضرا پر نچھاور کر کے آج دنیا والوں کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور کل قیامت کے دن خدا کے سامنے بھی لے جاؤں گا"۔ پیش لفظ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے قلم سے ہے۔ سرورق دیدہ زیب۔ طباعت اچھی۔

رسولِ پاک کی صاحبزادیاں | تالیف: جناب اعجاز الحق قدوسی۔ ناشر: مکتبہ فلاحِ انسانیت کراچی، قیمت ۱/۵۰

عنوان واضح ہے اس کتاب کا روئے سخن بچیوں کی طرف ہے اور ان کے سامنے حضور پاک کی صاحبزادیوں کے واقعات و حالات سبق حاصل کرنے کے لیے سادہ طریق بیان سے رکھے گئے ہیں۔ اس کا سرورق بھی بہت خوشنما ہے۔

تفہیم القرآن میں ضروری تصحیح

"تفہیم القرآن" جلد اول صفحہ ۲۵۶، حاشیہ نمبر ۵۵ کی سطر ۴ تا ۷، میں تین جگہ لفظی ترمیم کردی گئی ہے۔

اصلاح شدہ عبارت درج ذیل ہے۔ تبدیل شدہ الفاظ پر خط کھینچ دیا گیا ہے:

......انسان کو اس بات کا قائل کرنا چاہتا ہے کہ .... بندوں کو راہِ راست پر لانے کی تدبیر کرنا یہ دراصل اللہ کا کام ہے۔ اور جو بندے اس کام میں اللہ کا ساتھ دیں......

ناظرین حضرات براہ کرم اپنے نسخوں میں اصلاح فرمالیں اور دیگر قارئین "تفہیم" کو بھی نوٹ کرادیں۔

خریدار حضرات نوٹ فرمالیں،

قمری اور انگریزی مہینوں کا فرق رفع کرنے کے لیے یہ پرچہ قمری مہینے کے لحاظ سے جمادی الاخریٰ ۱۳۷۷ھ اور انگریزی مہینے کے لحاظ سے مارچ ۱۹۵۸ء کا ہے چونکہ خریداروں کے چندے کا شمار قمری مہینوں کے لحاظ سے ہوتا ہے، اس لیے اُن کے لیے سال بھر کے بارہ پرچوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ وہ مطمئن رہیں۔

خالی صفحہ

Our English Literature

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study.

PP. 231-Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic way of thought and life, and our present social and political problems.

PP. 72-Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet.

PP. 64-Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56-Price As. 14

5. **Economic Problem of man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi

PP. 55-Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944

PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi PP. 96-Price Re. 1/8

8. **After Secularism what?**—By Mohammad Mazahr-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56-Price As. 12

9. **Maudoodi on Islamic Law and Constitution**—

Price Rs. 4/8

Can be had from

Markazi Maktaba-e-Jamat-e-Islami Pakistan

Ichhra LAHORE